اسلام کے بنیادی عقیدے پر ایک تحقیقی نظر

کشف التوحید

سید باقر نثار زیدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب ـــــــــــــــ کشف التوحید

مصنف ـــــــــــــــ سید باقر نثار زیدی

ناشر ـــــــــــــــ ولایت مشن پبلیکیشن

کمپوزنگ ـــــــــــــــ سید آفتاب حسین رضوی

ٹائٹل ـــــــــــــــ سید آفتاب حسین رضوی

طبعِ اوّل ـــــــــــــــ جولائی ۲۰۱۱ء

تعداد ـــــــــــــــ ۱۰۰۰۰

رابطہ موبائل:0334-3596762، 0333-2120721

یہ کتاب مندرجہ ذیل websites پر پڑھی اور Download کی جاسکتی ہے

www.wilayatmission.com

www.alihaq.com

کتاب ملنے کا پتہ

(۱) علمدار بک ڈپو۔ امام بارگاہ شہداء کربلا انچولی کراچی

(۲) القائم بک ڈپو بالمقابل امام بارگاہ بھون روڈ چکوال

(۳) بخاری بک ڈپو تحصیل کروڑ لعل عیسن ضلع لیّہ

یا علیؑ مدد

یا علیؑ! میں آپ کے در کا بھکاری ہوں اور جھولی پھیلائے کھڑا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ہی ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کی پوشیدہ رہ کر بھی مدد کی تھی اور ظاہر بظاہر بھی۔تو کیا آپ اپنے ایک ادنیٰ غلام کی مدد نہیں کریں گے؟۔ مجھے آپ کا حقِ غلامی ادا کرنا ہے، ہر حال میں کرنا ہے، زندگی اور موت کی پروا کئے بغیر کرنا ہے لیکن میں کیا کروں کہ میں آپ کا یہ حق بھی ادا نہیں کرسکتا جب تک آپ کی مدد شاملِ حال نہ ہو۔ میں آج ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھانے جارہا ہوں جس کی کلید آپ ہیں کیونکہ مجھے زیارتِ جامعہ کا وہ جملہ یاد ہے کہ ''اے میرے آقا! جب ہم توحید کا ارادہ کرتے ہیں تو ابتداء آپ سے کرتے ہیں''۔ آج میں اسی توحید کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور اسی لئے ابتداء آپ سے کر رہا ہوں۔ اے میرے دستگیرؑ! میرا ہاتھ تھام لیں، اس طرح کہ کام میرا ہاتھ کرے لیکن جنبش آپ کی ہو۔

مدد! اے اللہ کے مددگار مدد!

نقشِ سادگی

سادگی ایک ایسا بے بس لفظ ہے جسے ہر شخص اپنے مقصد کیلئے جس طرح چاہے استعمال کرلیتا ہے۔ عام طور پر یہ لفظ ایسے آدمی کیلئے استعمال ہوتا ہے جسے نہ اپنی خبر ہو اور نہ دوسروں کی۔ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے اور مرجاتا ہے۔ تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے بعض لوگ کسی کو ''بے وقوف'' کہنے کے بجائے ''سادہ'' کہنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ بے وقوف کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ بعض لوگ اِس لفظ سے پہلے ''سیدھا'' کا بھی اضافہ کرلیتے ہیں جس سے اس کی شدّت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ البتہ ایک لفظ ہے جو اس کے بعد لگایا جاتا ہے جس سے اصلاح کا کچھ امکان پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ہے ''لوح''۔ ''لوح'' کے معنی ہیں تختی اور ''سادہ لوح'' ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو اُس تختی کی مانند ہوتا ہے جس پر کچھ بھی نہ لکھا ہو۔ آسان الفاظ میں اسے ''کورا کاغذ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ یہ کورا کاغذ اگر کہیں کسی غلط کاتب کے ہتھے چڑھ گیا تو سمجھو کہ وہ گمراہی کا سرچشمہ بن گیا۔ اب تک وہ اکیلا تھا لیکن اب اُس کی پوری نسل اس کے رنگ میں رنگ جائے گی اور یہ ایک نہ تھمنے والا سلسلہ ہوگا سوائے اس کے جس پر اللہ اپنا رحم فرمادے۔

یہ سادہ لوح اشخاص جب مذہب کے دائرے میں قدم رکھتے ہیں تو تین اقسام میں

تقسیم ہو جاتے ہیں۔ایک تو وہ ہیں جو طبیعت کے اعتبار سے سادہ لوح ضرور ہوتے ہیں لیکن کچھ آبائی عقائد وراثتاً لیکر اس دنیا میں آتے ہیں۔اور چونکہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے رفتہ رفتہ وہ آبائی عقائد اس قدر راسخ ہو جاتے ہیں کہ اسے چند ریڈی میڈ عقائد اور چند بے معنی و بے روح اعمال کے علاوہ سب کچھ غلط نظر آتا ہے۔ایسے لوگ اپنے آبا و اجداد کے عقیدے اور ان کے اعمال کو ہی اپنی سچائی کی طاقت سمجھنے لگتے ہیں اور جب ان سے کوئی عقل کی بات کی جائے تو وہ عقل کو ایک اچھوت مخلوق سمجھتے ہوئے اسے پَرے دھکیل دیتے ہیں اور اپنے پرانے ڈھرّے پر ہی جمے رہتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کا قول قرآن نے یوں نقل کیا ہے کہ ''ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر پایا اور ہم تو انہی کی پیروی کرتے ہیں (اور کرتے رہیں گے)''۔ایسے لوگ اُس دیہاتی طالبِ علم کی مانند ہوتے ہیں جسے استاد ایک گھنٹے تک پڑھاتا ہے، رٹاتا ہے کہ بیٹا کہو ''م،ر۔مُ۔ر۔غ،ا۔غا=مرغا''۔لیکن جب وہ اتنی مغز ریزی کے بعد شاگرد سے پوچھتا ہے تو وہ کہتا ہے۔''م،ر۔مُ۔ر۔غ،ا۔غا=ککّڑ۔ایسے لوگوں کا علاج صرف اچھی صحبت ہے۔اگر اللہ کا کرم اس کے شاملِ حال ہو اور وہ خوش عقیدہ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگے تو یہی سادگی اس کے کام آتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ انہی لوگوں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو دنیوی معاملات میں تو اچھے خاصے ہوشیار اور سمجھدار نظر آتے ہیں لیکن جہاں دین کا معاملہ آیا تو وہ جان بوجھ کر سادہ لوح بن جاتے ہیں اور جسطرح وہ دنیوی معاملات میں عقل سے کام لیتے ہیں وہیں دینی معاملات میں وہ کورا

کاغذ بن کر خود کو مولوی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اب جو رہی سہی کسر ہوتی ہے وہ مولوی پوری کر دیتا ہے اور حاشیئے پر گلکاری کر کے عبارت کا رنگ اور بھی چوکھا کر دیتا ہے۔ دین کی بدنصیبی یہی ہے کہ جہاں امورِ دنیوی کا تعلق ہے وہاں لوگ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرتے ہیں۔ تحقیق کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ جانچتے ہیں، پرکھتے ہیں تب کسی بات پر یقین کرتے ہیں۔ لیکن دینی علوم کے حصّے میں صرف سنی سنائی باتیں ہی آتی ہیں اور مولوی کی عبا سے اپنی قمیض کا دامن باندھ لینا ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے ایسے اشخاص قطعاً ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں کیونکہ یہ دین کے معاملے میں غیر سنجیدہ ہوتے ہیں اور حقیقتِ دین کو جاننا ہی نہیں چاہتے۔ جب ان کے سامنے کوئی عقل کی بات کی جاتی ہے تو وہ اس بات کو عقل کی میزان میں تولنے کے بجائے، کہنے والے کی ڈگری اور مدرسے کا اتا پتا معلوم کرنے کی سعئِ لاحاصل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ایسے عقل سے عاری لوگوں سے ماتھا پھوڑنا احمقوں کا کام ہوتا ہے۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہوتے تو سادہ لوح ہیں لیکن کسی صحیح یا غلط بات کو دیکھ کر ٹھٹھکتے ضرور ہیں۔ اللہ کی توفیق ان کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ چونکہ وہ فطرتاً محبِّ اہلبیتؑ ہوتے ہیں اس لئے وہؑ بھی ایسے لوگوں کی دستگیری فرماتے ہیں اور وہ ایسی باتوں کو بھی سمجھ لیتے ہیں جو نام نہاد عقلمندوں کی فہم و عقل سے باہر ہوتی ہیں۔ یہ بزرگ اور قابلِ احترام لوگ ہوتے ہیں اور شیطانی شکنجوں میں پھنسے ہوئے ہونے کے باوجود وہ ہمہ وقت حق کے متلاشی رہتے ہیں اور جب حق مل جائے تو کہنے والے کو نہیں ڈھونڈتے بلکہ دلائل کی ترازو پر اس کو تولتے ہیں۔ ابتداً یہ لوگ دلائل تک رسائی نہ

پا سکنے کیوجہ سے اپنے آباء واجداد کے عقائد کے بارے میں لب کشائی کرنے سے ڈرتے ہیں لیکن محبتِ اہلبیتؑ ان میں وہ جراءت پیدا کر دیتی ہے کہ جیسے ہی انہیں حق نظر آتا ہے، وہ خوف اور توہمّات کے سارے جال توڑ کر حق سے ملنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہمارے مخاطب ہیں۔

رہے وہ لوگ جو ان سادہ لوحوں کے علاوہ ہیں تو یہ کتاب ان کیلئے ہماری طرف سے ایک ایسا انمول تحفہ ہے جو نہ صرف ان کے کام آئے گا بلکہ ان کی آئندہ نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گی۔ انشاء اللہ او انشاء علیؑ

عوام کا تصورِ توحید

لوگوں کی اکثریت کے نزدیک توحید کا تصور یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اِس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ ''اللہ ایک ہے'' کا مطلب کیا ہے کیونکہ وحدت کی دو اقسام ہیں وحدتِ عددی اور وحدتِ مطلقہ۔ ہمیں دیکھنا ہو گا کہ ہم اللہ کیلئے کون سی وحدت کے قائل ہیں اور یہ کہ وہ کون ہے جو اِس دنیا میں اللہ کی وحدت کا مظہر ہے۔

وحدتِ عددی

ایک (۱) سے لیکر نو (۹) تک جتنے بھی ہندسے ہیں انہیں اعداد کہا جاتا ہے اور ان تمام اعداد کی بنیاد اور ان کی ماں ایک (۱) ہے۔ یعنی اگر ایک نہ ہو تو کوئی عدد نہ تو پیدا ہو اور نہ باقی رہے۔ ہر شے کیلئے کسی نہ کسی اکائی کی ضرورت ہے۔ مثلاً کرنسی کی اکائی ہے

ایک روپیہ۔ اگر ایک روپیہ نہ ہوتو ایک ارب روپے بھی نہ ہوں۔ پانی اور دیگر مائع اشیاء کی اکائی ہے ایک لیٹر۔ اگر ایک لیٹر نہ ہوتو نہ سمندر باقی رہیں نہ تیل اور نہ دودھ۔ فاصلے کی اکائی ہے ایک میٹر۔ اگر ایک میٹر نہ ہوتو پوری کائنات سمٹ کر محض ایک نقطہ رہ جائے۔ آپ اگر تھوڑا سا بھی تدبر فرمائیں تو جان لیں گے کہ یہ پوری کائنات علم ریاضی پر قائم ہے۔ مجھے ایک فلاسفر کا ایک جملہ ہمیشہ سے پسند رہا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ''جب میں نے اس کائنات پر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ پوری کائنات کسی ریاضی داں کا خیال ہے''۔ ایک کی یہ اہمیت اپنی جگہ لیکن ہم جس وحدت کے قائل ہیں وہ اِس ایک (۱) سے ماوراء ہے۔

وحدتِ مطلقہ

آپ نے دیکھا کہ ہر شے ایک کی محتاج ہے لیکن خود ایک کسی کا محتاج نہیں۔ وہ خود اپنی جگہ قائم ہے لیکن تھوڑا سا اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بھی اپنی ذات پر قائم نہیں ہے بلکہ اپنے اجزاء کا محتاج ہے کیونکہ یہ قابلِ تجزیہ ہے۔ اس کا آدھا بھی ہوسکتا ہے، تہائی بھی ہوسکتا ہے اور چوتھائی سمیت اس کے لاتعداد اجزاء کئے جاسکتے ہیں اور یہ اجزاء محتاج ہیں نقطے کے جو اپنی ذات میں ناقابلِ تجزیہ ہے۔ یہی نقطہ ہے جسے ''واحدِ مطلق'' کہا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اللہ کو ایک کہا اور مانا جاتا ہے یعنی اگر نقطہ نہ ہوتا تو کوئی بھی اللہ کو ایک نہ مانتا اور اس طرح توحید نامی شے سے ایک شخص بھی واقف نہ ہوتا۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ ''نقطہ مظہرِ ذات ہے''۔

کُنتُ کَنزاً مخفیا

یہ نقطہ چونکہ اپنی ذات میں نا قابلِ تجزیہ ہے اس لئے کسی اعتبار سے بھی ظاہر نہیں ہوسکتا نہ ہی مشاہدے میں آسکتا ہے کیونکہ مشاہدے میں آنے کیلئے جہات (Dimentions) کی یعنی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جن میں سے ایک بھی اس نقطے میں موجود نہیں۔ لہٰذا جب اس نقطے نے اپنا تعارف کرانا چاہا تو چودہ اجزاء خلق کئے اس کے بعد جو چاہا خلق فرمایا اور یہ سلسلۂ خلق اس کے بعد تھما نہیں بلکہ آج بھی جاری ہے اور جاری رہے گا جیسا کہ اقبال نے کہا

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اور جیسا کہ سورۂ رحمن آیت ۲۹ میں اشارہ ہوا۔ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾۔ یعنی ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ معصومینؑ نے اس کی تفسیر یہی کی ہے کہ وہ ہر روز ایک نئی دنیا خلق کرتا ہے۔ پس جب تک یہ آیت قرآن میں موجود ہے ہر روز ایک نئی دنیا خلق ہوتی رہے گی۔ یہی نقطہ خلاّق کون ومکان ہے اور اُن تمام صفات کا مالک ہے جو اللہ نے خود سے منسوب کی ہیں۔ اور یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ اوّلین وآخرین میں اگر کسی نے نقطہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ میرا مولا امیرؑ المومنین ہے۔

ایک وضاحت

اس مقام پر ہم ایک وضاحت پیش کردینا ضروری سمجھتے ہیں جو ہم اپنی گزشتہ کتابوں

میں بھی کر چکے ہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ جو توحید کا صحیح ادراک نہیں رکھتے اس مخمصے میں نہ پڑ جائیں کہ جب سارے کام مولا علیؑ ہی سر انجام دے رہے ہیں تو پھر اللہ کیا کر رہا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے تا کہ کسی بھی مرحلے پر کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

جان لیجئے کہ اللہ کی ذات سے کسی بھی فعل کو منسوب کرنا درحقیقت توحید کا انکار کرنا ہے کیونکہ فعل کہتے ہیں ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کو اور حالت کا بدلنا تغیّر کہلاتا ہے۔ اگر اللہ کیلئے کسی بھی فعل کو مانا گیا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) اس کی ذات میں تغیّر ہوتا رہتا ہے اور اللہ کیلئے تغیّر محال ہے کیونکہ اس کیلئے نہ حال ہے نہ کیفیت۔ لہٰذا قرآن میں جہاں جہاں اس کے افعال یا کیفیات (مثلاً راضی ہونا یا غضبناک ہونا) کا بیان آیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ کرنے والا، راضی ہونے والا اور غضبناک ہونے والا کوئی اور ہے جس کے افعال و کیفیات کو اللہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ اسی کے افعال و کیفیات کو دیکھ کر اللہ کو مانا اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس بات کو مولا امیرؑ المومنین اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ ''میں اللہ کا ہاتھ ہوں۔ جو کچھ وہ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔ جو کچھ اس سے صادر ہوتا ہے میرے ذریعے سے ہوتا ہے کرتا میں ہوں کہلاتا اس کا ہے''۔ (کوکب دری صفحہ ۳۵)۔

جب فعل اور کیفیت کی اللہ سے نفی ہوگئی تو اب اللہ کے بارے میں سوچنا خود کو مصیبت میں ڈالنا ہے کیونکہ وہ ہماری عقل، وہم اور گمان سے ماوراء ہے اور اس کے بارے میں سوچنے اور گفتگو کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے

اور مخلوق کے درمیان ایک وسیلہ قرار دیا ہے اور اسے ڈھونڈنے کا حکم دیا ہے۔ ہماری حد اسی وسیلے تک ہی محدود ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہم سوچیں گے اس وسیلے کے بارے میں ہی سوچیں گے۔ اس سے آگے بڑھنے کی نہ ہم میں طاقت ہے اور نہ جراءت۔ ہاں اگر کسی کو پاگل ہونے کا شوق ہے وہ ضرور اللہ کے بارے میں سوچے اور جنگلوں اور بیابانوں میں اسے ڈھونڈتا پھرے مگر اس یقین کے ساتھ کہ وہاں دو ہی چیزیں مل سکتی ہیں۔ شیطان اور سانپ بچھّو۔

تاریخ اور مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ انسان نے جب سے اس کُرۂِ زمین پر قدم رکھا ہے تب سے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایک نا قابلِ تجزیہ اکائی کی تلاش میں ہے اور چونکہ وہ خود اس بات کی طاقت نہیں رکھتا تھا کہ اسے تلاش کر سکے اس لئے اُس نے سہارے ڈھونڈنے شروع کئے۔ اُس نے جس شے کو بھی طاقتور پایا اس کے سامنے جھک گیا، اس امید پر کہ شاید وہ طاقتور شے اسے اُس نا قابلِ تجزیہ وجود کا تعارف کرا دے۔ چنانچہ اگر آپ مذاہب عالم کا مطالعہ کریں تو جان لیں گے کہ انسان نے ہمیشہ وسیلہ کی پرستش کی ہے اور آج تک یہ آس لئے بیٹھا ہے کہ شاید کبھی یہ وسیلہ اسے اس کی مطلوبہ شے تک پہنچا دے۔ کسی نے اُس وسیلے کا نام گاڈ (God) رکھا، کسی نے بھگوان رکھا اور کسی نے خدا رکھا۔ لیکن جب یہ اپنی مطلوبہ شے پانے میں ناکام ہو گئے تو تھک ہار کر انہوں نے وسیلے ہی کو اپنی مطلوبہ شے سمجھ لیا اور جس نے بھی وسیلے پر گفتگو کرنا چاہا اس پر شرک کے فتوے داغنے لگے، یہ سوچے بغیر کہ اصل مشرک وہ خود ہیں اور اس احمقانہ مشغلے میں مسلمان، کیا سنّی کیا شیعہ، سبھی پیش پیش ہیں۔ ان کے

محبوب الفاظ دو ہیں۔غلو اور شرک جن پر ان کے مسلکوں کی بنیاد قائم ہے۔ اگر یہ دو الفاظ ہٹا دیئے جائیں تو یہ لوگ بے دین ولا مذہب ہو جائیں گے۔

ذہنی چھلانگ

انسانی عقل جب نقطے تک پہنچ گئی تو بہت سے عقلمندوں نے، دانشوروں نے، علماء نے اور چند نام نہاد عارفین نے یہ مفروضہ قائم کرلیا کہ یہ نقطہ ہی خدا ہے جبکہ میری عرضداشت یہ ہے کہ اے بھائی عقلمندو! انسان تو جس نا قابلِ تجزیہ اکائی کی تلاش میں تھا وہ تو وہ شے تھی جس کی معرفتِ عقلانی ممکن تھی جبکہ اللہ تو وہ ہے جو حدودِ عقلانی سے ماوراء ہے۔نقطے کے وجود کو جب ہم نے عقلی طور پر پہچان لیا تو وہ تو ہماری حدودِ عقلانی میں آ گیا۔تو کیا تم اللہ کو محدود کرنا چاہتے ہو اور کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم کسی بھی اعتبار سے اللہ کو پہچان سکتے ہو، اسے اپنے وہم میں لا سکتے ہو، اور اس سے کسی بھی قسم کا رابطہ قائم کر سکتے ہو؟۔ اگر ایسا ہے تو تم اس بات کا یقین کرلو کہ تم ایک ایسی شے کی پرستش کر رہے ہو جو تمھارے اپنے ذہن کی مخلوق ہے، نام اس کا جو جی چاہے رکھ لو اور اس بات کا بھی یقین کرلو کہ یہ نِرا کھَرا شرک ہے جس کو تم توحید سمجھ رہے ہو۔

دوسرے یہ کہ نقطہ مکان میں داخل ہے جبکہ اللہ لامکان ہے۔لیکن مکان کے اندر یہ نقطہ ہر جگہ موجود ہے اور اس نے مکان کا احاطہ کر رکھا ہے تیسرے یہ کہ نقطے کی معرفت ہم اس کی مخلوق یعنی دائرے کے ذریعے حاصل کرتے ہیں جبکہ اللہ کے بارے میں امام رضاؑ فرماتے ہیں۔'' اے اللہ! میں اُن سے براءت طلب کرتا ہوں جو تجھے تیری

مخلوق کے ذریعے پہچاننا چاہتے ہیں؟ (صحیفۂ رضا صفحہ ۴۳)۔لہٰذا کبھی ایسا گمان بھی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ نقطہ سب کچھ صحیح لیکن بہر حال اللہ کا عبد ہے اور جو کچھ کرتا ہے اسی کے اذن سے کرتا ہے اس لئے اِس حقیقت کا ادراک رکھنا ضروری ہے کہ نقطہ خدا نہیں بلکہ دلیلِ وجودِ خدا ہے۔ایمان و کفر اور وحدانیت و شرک میں بڑا باریک سا فرق ہے اور اس مقام پر لازم ہے کہ انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے اور یہ احتیاط جیسا کہ عرض کیا گیا، کچھ مشکل بھی نہیں۔خود ائمہؑ طاہرین کا ارشاد ہے۔''ہمارے لئے ایک رب تسلیم کرو پھر جو تمھارا دل چاہے ہماری فضیلت میں کہو۔پھر بھی تم ہماری کسی ایک صفت تک نہیں پہنچ سکتے'' (بحارالانوار)۔لہٰذا ان کے فضائل بیان کرنے میں احتیاط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم کچھ بھی کہہ لیں پھر بھی ان کے فضائل ہماری پہنچ سے باہر ہی رہیں گے احتیاط کی ضرورت صرف اتنی ہے کہ ان کے فضائل بیان کرتے وقت یہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ ان کا بھی کوئی رب ہے۔ناواقف لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ ان کے فضائل بیان کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور انہیں حد سے نہیں بڑھانا چاہیئے ورنہ نصیری ہوجاؤ گے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کوئی حد متعین کرنا اللہ کو محدود کرنا ہے کیونکہ یہ افعالِ خدا کے امین ہیں اور اللہ نے قرآن میں جن جن افعال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے وہ انہی کے مقدس ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں۔اللہ کی ہر شان انہی سے ظاہر ہوتی ہے۔اللہ کی ہر بات انہی کی زبان مبارک سے ادا ہوتی ہے۔انہی کو دیکھکر ہم نے اللہ کو اللہ مانا ہے۔ہم میں اور نصیری میں فرق یہ ہے کہ ہم ان کے فضائل کی لامحدودیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ان

کی عبدیت کے قائل ہیں جبکہ نصیری ان کے فضائل کو تو مانتا ہے مگر ان کی عبدیت کا قائل نہیں ہے۔ اور یہی بات مومن اور نصیری کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

ہم نے پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ حقیقتِ حال آپ کے سامنے بیان کر دی ہے اور یہ کوئی ایسی مشکل بات ہے بھی نہیں جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ صرف ایک جملہ ذہن میں رکھنا ہے کہ ''ان ذواتِ مقدسہ کے فضائل کی لامحدودیت کو تسلیم کرتے ہوئے اِن کی عبدیت کا قائل رہنا ہے''۔ اور اب ہم بجا طور پر یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ان کی کوئی بھی فضیلت سن کر آپ کا دل نہیں دھڑکے گا اور ان کا کوئی بھی مقام دیکھ کر آپ کے ماتھے پر پسینہ نہیں آئے گا کیونکہ آپ نے جان لیا ہے کہ ان میں کسی قسم کا نقص قبول کرنا دراصل اللہ کو ناقص ماننا ہے اور ان کے فضائل کو محدود سمجھنا درحقیقت اللہ کو محدود جاننا ہے کیونکہ یہ اللہ کے مظہر ہیں اور اگر ان میں کسی کمی کا امکان پیدا ہو گیا تو وہ ناقص ہو جائے گا جس کا یہ مظہر ہیں۔ اصل فساد یہاں سے شروع ہوا ہے کہ ہمارے مولویوں نے لوگوں کے ذہنوں میں اللہ کے بارے میں چند خود ساختہ تصورات بھر دیئے ہیں اور لوگ انہی تصورات کی بنیاد پر اللہ کو مانتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ اللہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے اپنے وہم و گمان میں لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح جس اللہ کو وہ مانتے ہیں وہ مولوی کا تراشا ہوا ایک بت ہوتا ہے جس میں بہت سے رنگ بھرے ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ رنگ کسی اور میں نظر آ جائیں تو اسے ''غلو'' کا نام دے دیا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

بے حد و لامتناہی ہے ہمارا مطلوب
جس قدر بھی اسے جانا ہے سو کم جانتے ہیں

اِن ذواتِ مقدسہ کے فضائل تو رہے ایک طرف، میں اگر مومن کے فضائل سے پردہ اٹھادوں تو آپ اپنے حواس کھو بیٹھیں گے۔

اگر ہماری بات آپ تک پہنچ گئی ہے تو جان لیجئے کہ اب جو ہم تعارفِ توحید آپ سے کرائیں گے تو انہی ذواتِ مقدسہ کے ذریعے کرائیں گے اور انہی کے اقوال و افعال دیکھ کر ہی پہچانیں گے کہ توحید کیا ہوتی ہے۔ لیکن یقین شرط ہے کیونکہ بقول علامہ حافظ رجب البرسی ''شک کے ساتھ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے مانتے ہیں جسے حقیقتاً نہیں مانتے''۔

بیانِ توحید کا آغاز کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ ایک اور چیز کا ذکر کر دیا جائے جس کے بغیر توحید کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انبیاؑء آئے تو ایمان کی ترغیب دینے کیلئے۔ قرآن میں جگہ جگہ دعوت دی گئی ہے تو ایمان کی۔ اللہ نے خطاب کیا ہے تو مومنین سے، خوش خبریاں دی ہیں تو صاحبانِ ایمان کو اور احکام بیان کئے ہیں تو ایمان لانے والوں کیلئے۔ لیکن کیا آپ کو یہ جان کر حیرت نہیں ہوگی کہ مومن بننے سے پہلے کافر بننا ضروری ہے؟۔ کیونکہ جس کلمے کو پڑھ کر آپ مومن کہلاتے ہیں وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک کلمۂ کفر ہے یعنی ''لا الٰہ'' اور ایک کلمۂ ایمان ہے یعنی ''الّا اللّٰہ''۔ لہٰذا الّا اللہ سے پہلے ''لا الٰہ'' کی معرفت ضروری ہے ورنہ ''الّا اللّٰہ'' بے معنی ٹھہرے گا۔

معرفتِ طاغوت

بقرہ ۲۵۶۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

ترجمہ:۔''دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ یقیناً ہدایت اور گمراہی کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا۔ پس جس نے کفر کیا طاغوت سے اور ایمان لایا اللہ پر تو یقیناً اُس نے ایک ایسی رسی کو تھام لیا جو ٹوٹنے والی ہے ہی نہیں اور اللہ سمیع بھی ہے اور علیم بھی''۔

مندرجہ بالا ارشادِ خداوندی سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ ہمارا مقصدِ حیات یقیناً اللہ پر ایمان لانا ہے لیکن ایمان باللہ سے پہلے طاغوت سے کفر کرنا لازمی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو ایمان باللہ بے معنی ٹھہرے گا اور اس کا دعویٰ کرنے والا یا تو احمق ہوگا یا پھر منافق۔

کسی بھی شے کو ماننے یا رد کرنے سے پہلے اُس شے کی معرفت ضروری ہے کیونکہ بغیر معرفت کے ماننا یا رد کرنا سراسر گمراہی ہے۔ اگر آپ کو یہی نہیں معلوم کہ اللہ سے کیا مراد ہے تو اس پر ایمان لانا ایک بے معنی بات ہے۔ اور اگر آپ کو یہ خبر نہیں کہ طاغوت کون ہے تو اس سے کفر کرنا خود اپنی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں معلوم ہے کہ سانپ ایک خطرناک جانور ہے اس لئے جیسے ہی ہم اسے دیکھتے

ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ اسے مار ڈالیں لیکن اگر ایک شیر خوار بچہ لیٹا ہوا ہو اور سانپ اس کے پاس آجائے تو وہ اس سے کھیلتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ رویّوں میں یہ فرق بتا رہا ہے کہ آپ سانپ سے اس لئے ڈرتے ہیں اور اس لئے اسے مارنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ اس کی معرفت رکھتے ہیں اور بچہ اس لئے نہیں ڈرتا کہ وہ اُس کی معرفت نہیں رکھتا۔ اسی طرح اگر آپ طاغوت کی معرفت نہیں رکھتے تو اس سے کفر کیسے کریں گے؟۔ اس سے پہلے شاید کسی نے اس بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا۔ اگرچہ ہمارا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھیں لیکن چند ناگزیر مجبوریوں نے ہمیں اس کام سے روک دیا۔ اس مقام پر ہم انتہائی اختصار کے ساتھ اپنا مدعا بیان کریں گے، صرف اس حد تک کہ آپ اپنے دشمن کو جان لیں۔ اس کے بعد اگر آپ کو اپنی عاقبت عزیز ہے تو آپ خود غور کریں گے، اپنے مشاہدات کو کام میں لائیں گے، اپنے اردگرد نظر رکھیں گے اور خود کو اپنے دشمن سے بچائیں گے جیسا کہ دنیوی معاملات میں بچاتے ہیں۔

آغاز

ایک شخص تھا جس کا نام عزازیل تھا۔ یہ اُس قوم کا ایک فرد تھا جس کو ''جان'' کے نام سے پکارتے تھے اور اس قوم کا کام اہل بہشت کے زیور بنانا تھا۔ پھر کوئی ایسی بات ہوئی کہ یہ عتابِ خدا کا شکار ہوگئی اور اسے زمین پر بھیج دیا گیا جہاں اس کا نام ''جِن'' رکھا گیا۔ زمین پر آتے ہی یہ اپنی اصل فطرت کیطرف لوٹ آئی اور زمین میں فساد

اورخوں ریزی شروع کردی یہاں تک کہ پوری زمین فساد سے بھر گئی لیکن اس تمام ہنگامۂ ہاو ہُو میں صرف عزازیل ایسا تھا جو ان تمام سرگرمیوں سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا ہوا عبادتِ خدا کیا کرتا تھا۔آخر تنگ آکر اس نے اللہ سے دعا کی کہ وہ اسے اِس فساد فی الارض سے نجات دے اور واپس اُس کی پہلی جگہ پر بلا لے۔ اللہ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اسے فرشتوں کی محفل میں لاکر بٹھا دیا جہاں یہ فرشتوں کے ساتھ عبادت کرنے لگا یہاں تک کہ عبادت وریاضت میں فرشتوں سے بھی بڑھ گیا اور شاید اسی لئے اسے استادِ ملائکہ کہا جاتا ہے۔ جس طرح سادات اصلاً عرب ہیں لیکن وہ جہاں بھی آباد ہوئے وہیں کے لوگوں کا حصہ بن گئے اور انہی کے رسم و رواج اپنا لئے۔ اسی طرح ایک عرصۂ دراز تک فرشتوں کے ساتھ رہتے رہتے عزازیل کا شمار بھی فرشتوں میں ہونے لگا۔ یہاں ایک عرض کرنا ضروری ہے۔ اسے انتہائی غور سے پڑھیئے اور گرہ سے باندھ لیں۔ پھر انشاء اللہ آپ کبھی شیطان سے دھوکا نہیں کھائیں گے چاہے وہ کسی بھی روپ میں آجائے اور وہ عرض یہ ہے کہ ’’دشمنی شخصیت سے نہیں ہوتی بلکہ کردار سے ہوا کرتی ہے‘‘۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اگر کوئی چور کسی کے گھر میں چوری کرے تو وہ شخص جس کے گھر میں چوری ہوئی ہے اُس خاص آدمی کا دشمن ہوجائے گا جس نے اس کے گھر میں چوری کی ہے۔ دوسرے چوروں کیطرف اس کا دھیان جائے گا ہی نہیں۔ حالانکہ دشمنی چور سے نہیں بلکہ چوری سے ہونی چاہیئے چور کوئی بھی ہو اور کہیں بھی چوری کرے سب ایک ہی درجے کے مجرم ہیں۔ ہمارے دینی مجرموں نے یہی شعبدہ دکھایا ہے کہ مذمت، لعنت اور ملامت کو

صرف چند لوگوں تک محدود کر دیا ہے۔ اب لوگ اٹھتے بیٹھتے اُن چند لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچتے بھی نہیں جنھوں نے انہی لوگوں کا کردار اپنا رکھا ہے جن پر وہ لعنت کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی ستائش اور پیروی کرتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر ایسے لوگوں کا حشر انہی لوگوں کے ساتھ ہونا ہے جن پر وہ لعنت بھیجا کرتے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ اگر ایک شخص علیؑ کا حق غصب کرے تو اس پر تو لعنت ملامت کی جائے اور اگر کوئی ہمارے زمانے کا آدمی یہی کام کرے تو اس پر درود بھیجا جائے؟۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات ظاہر بظاہر کڑوی لگے لیکن اگر آپ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو یقیناً ہم سے اتفاق کریں گے۔

عزازیل ایک شخصیت تھا جس سے ہمیں کوئی غرض نہیں اور نہ ہی اللہ نے اس کا کوئی ذکر کیا ہے۔ اصل معاملہ وہاں سے شروع ہوا جب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اُس وقت یہ عزازیل ایک کردار بن گیا اور اس کا نام ابلیس رکھا گیا۔ سجدۂ آدمؑ کی حقیقت کیا تھی وہ اس واقعے سے ظاہر ہو جائے گی جو ہم پیش کرنے جا رہے ہیں۔

کتابِ سلیم بن قیس (فارسی) صفحہ ۲۲۰۔

جب بعد رسولؐ اللہ علیؑ غسل و تکفین میں مصروف تھے تو دوسری طرف کوئی دوسرا ہی کھیل کھیلا جا رہا تھا اور نوزائیدہ خلیفہ صاحب منبرِ رسولؐ پر بیٹھ کر لوگوں سے بیعت لے رہے تھے۔ اس وقت سلمان فارسیؓ وہاں موجود تھے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ فوراً مولا علیؑ کے پاس پہنچے اور سارا ماجرا سنایا کہ لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ایک ہاتھ سے بیعت کرنے پر راضی نہیں تھے بلکہ دائیں بائیں دونوں ہاتھوں سے بیعت کرنے میں ایک

دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرر ہے تھے۔امیرؑ المومنین نے پوچھا کہ بیعت کرنے والا پہلا شخص کون تھا؟ سلمان نے جواب دیا کہ میں نے ایک سالخوردہ بوڑھے کو دیکھا جس نے اپنے عصا پر ٹیک لگائی ہوئی تھی اوراس کی دونوں آنکھوں کے درمیان سجدوں کے گہرے نشان موجود تھے۔وہ پہلا شخص تھا جومنبر پر چڑھا، اس حال میں کہ وہ رورہا تھااور کہہ رہا تھا۔"شکر ہے خدا کا کہ اس نے مجھے موت نہیں دی جب تک میں نے تجھےاس مقام پرنہیں دیکھ لیا۔اپنا ہاتھ پھیلا کہ میں بیعت کروں اور بیعت کرنے کے بعد کہا۔

"آج کا دن آدمؑ والے دن کی طرح ہے۔ پھروہ منبر سے اترا اور مسجد سے نکل گیا۔ امیرؑ المومنین نے پوچھا۔"اے سلمان! جانتے ہو وہ کون تھا؟"۔سلمان نے کہا۔ "نہیں۔لیکن اس کی باتوں سے مجھے بہت تکلیف پہنچی کیونکہ وہ وفاتِ رسولؐ کو بڑے تضحیک آمیز طریقے سے بیان کررہا تھا"۔فرمایا۔"وہ ابلیس تھا۔اللہ اس پر لعنت کرے"۔

جولوگ صاحبانِ عقل ہیں وہ سمجھ لیں گے کہ سجدۂ آدمؑ کی حقیقت کیا تھی اور ابلیس نے کس کی دشمنی میں آدمؑ کوسجدہ نہیں کیا تھا۔

بہرحال یہاں سے وہ ابلیس بنا۔یہ کوئی شخصیت نہیں بلکہ کردار تھا اوراس کردار میں اس نے چار کام کئے:۔

ا۔قیاس

جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"اوّلُ من قاسَ فھُوَ ابلیس"۔یعنی وہ پہلا

شخص جس نے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔ اور اس قیاس کی بنیاد قرآنِ مجید نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۱ میں یوں بیان فرمائی

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے کہا کہ کیا میں اس کیلئے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا''

ابلیس جانتا تھا کہ یہ حکم کون دے رہا ہے۔ وہ اسے اللہ کہتا تھا مگر جانتا تھا کہ وہ علیؑ ہے۔ اُس پوشیدہ حالت میں علیؑ اسے قبول تھا لیکن جب اسے آدمؑ کا پتلا دکھا کر بتایا گیا کہ جب علیؑ لباسِ بشر میں آئے تو اس وقت بھی اس کی ویسی ہی تعظیم اور ویسی ہی اطاعت کرنی ہے جیسے کہ وہ علیؑ کی پوشیدہ حالت میں کرتا تھا تو اس کی رگِ ابلیسیت پھڑک اٹھی۔ عالمِ انوارِ الوہیت میں علیؑ اس کو قبول تھا۔ وہاں وہ اسے سجدے کیا کرتا تھا اور اپنے سجدوں پر فخر کیا کرتا تھا مگر مٹی کے پیکر میں علیؑ اس کو قبول نہ ہوا اور اس نے قیاس کیا کہ اِس حالت میں میں اس سے افضل ہوں۔ مولا امیرؑ المومنین اِس صورتِ حال کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

''میں ہی قیامت برپا کروں گا۔ میں ہی اُس گھڑی کو معیّن کرنے والا ہوں۔ میں ہی وہ ہوں جسے اللہ نے روحوں کے سامنے پیش کیا اور پھر ان کو میری اطاعت کیلئے بلایا (یہ اشارہ ہے یوم الست کی طرف) اور جب میں ان کے سامنے آیا تو انکار کر بیٹھے۔ میں پچھلی کتابیں بھیجنے والا ہوں۔ میں مسیح تھا اس وقت بھی جب کوئی روح خلق نہیں ہوئی تھی اور نہ کوئی میرے علاوہ سانس لینے والا تھا۔ میں وہ ہوں جس کی ولایت کے بغیر اعمال قبول نہیں ہوتے''۔ (مشارق الانوار صفحہ ۲۱۸)

عجیب بات ہے کہ عموماً لوگ باطن کا انکار کرتے ہیں اور ظاہر کا اقرار کرتے ہیں لیکن ابلیس نے اپنے قیاس کی بنیاد پر سُوئی الٹی گھما دی یعنی باطن کا اقرار کیا اور ظاہر کا انکار کر دیا۔ اور آج لوگوں کی اکثریت اسی کلّیے پر عمل کر رہی ہے کہ باطن کا دم بھرتی ہے اور ظاہر سے کراہت کرتی ہے لیکن اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا اگرچہ مشرک کراہت ہی کیوں نہ کریں۔

یہ ایک کردار تھا، اسے کردار ہی سمجھیں اور جو کوئی لوگوں کو علیؑ کی اطاعت سے لاتعلق کر کے اپنی اطاعت کی دعوت دے اور انؑ کے اختیارات پر دست درازی کرے اور قدم قدم پر قیاس کرے تو سمجھ لیجئے کہ یہ وہی کردار ہے جو رنگ بدل کر لوگوں کے سامنے آ رہا ہے۔

۲۔ عدلِ خداوندی کا انکار

افضل کو مفضول کے آگے جھکانا خلافِ عدل ہے اس لئے ابلیس نے اپنے قیاس کی بنیاد پر اللہ کے حکم کو خلافِ عدل جانا اور اس طرح (معاذ اللہ) اللہ پر ظلم کا الزام عائد کیا۔ لہٰذا جہاں فضیلت کا کوئی معیار مقرر نہ ہو اور (Pick & Choose) پر عمل کیا جا رہا ہو تو جان لیجئے کہ وہاں یہی کردار کارفرما ہے۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت ہو تو ہماری کتاب ''کشف التضاد'' کا ضمیمہ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ انکار اور تکبّر

جیسا کہ بقرہ ۳۴ میں ارشاد ہوا ﴿اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾۔

اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ تو تھا ہی کافروں میں سے

یہ تو آپ جان چکے کہ ابلیس نے کس بات کا انکار کیا تھا۔ اگر آدمؑ اپنی ذات میں سجدے کے حقدار ہوتے تو ان کے ساتھ وہ کچھ نہ ہوتا جو کچھ کہ ہوا۔ انہیں جنت سے نہ نکالا جاتا۔ انہیں زمین پر ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں۔ پاؤں زخمی نہ کرنے پڑتے اور برسہابرس توبہ نہ کرنی پڑتی۔ ابلیس جانتا تھا کہ آدمؑ کو لائقِ سجدہ اُس جزئی روح نے بنایا تھا جو ان میں پھونکی گئی تھی لہٰذا اُس نے درحقیقت اُس روح کا انکار کیا تھا اور جیسا کہ آپ گزشتہ اوراق میں فرمانِ امیرؑالمومنین پڑھ چکے ہیں کہ روحوں کے خالق میرے مولا علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں لہٰذا ابلیس نے حقیقتاً ولایتِ امیرؑالمومنین کا انکار کیا تھا اور اپنی ظاہری خلقت کو دیکھتے ہوئے تکبر کیا تھا اور ان دونوں چیزوں کو قرآن نے علاماتِ کفر قرار دیا ہے لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ ولایتِ علیؑ کو اپنا ایمان قرار دے اور ان کی خلقتِ بشری کو اپنی خلقت پر قیاس نہ کرے۔ ابلیس کو اتنی سخت سزا ملی ہی اس لئے تھی کہ اُس نے نورِ عظمتِ خداوندی کی ہیئتِ بشریہ کی معرفت میں تقصیر کی تھی تو پھر سوچیئے کہ جو شخص ان کی معرفتِ نورانیہ میں تقصیر کرے اسے کیا نام دیا جائے گا!

۴۔ حسد

حسد کا مطلب ہے کسی پست مرتبہ شخص کی یہ خواہش کرنا کہ کوئی بلند مرتبہ شخص اپنے مقام سے گر کر نیچے آجائے تاکہ دونوں برابر ہو جائیں۔ اس صفت کا موجد ابلیس ہے۔ پہلا حاسد وہی ہے اور پہلا محسود میرا مولاؑ ہے۔ آج بھی جو لوگ اس کوشش میں ہیں کہ علیؑ کی شان میں تقصیر کر کے خود کو ان کے برابر لے آئیں تو وہ یقیناً قبیلۂ ابلیس سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابلیسِ بزرگ

یہ بات بہت اہم ہے کہ اگرچہ ابلیس ہی ہمارا ہدفِ طعنہ وتشنیع ہے مگر کوئی اور بھی ہے جو اس کا بھی استاد ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ یہ نہ فرماتا کہ ''وکانَ من الکٰفرین''۔ یعنی وہ (ابلیس) تو تھا ہی کافروں میں سے۔ یعنی کچھ اور بھی ایسے بزرگ کافر موجود تھے کہ ابلیس جن کا Junior تھا اور جن کی تقلید کر کے ہی وہ عزازیل سے ابلیس بنا تھا۔ ان میں سے ایک بزرگ کا تعارف کرانے کیلئے ہم کتابِ سلیم بن قیس (فارسی) سے دو روایات پیش کرتے ہیں تا کہ آپ کی معرفتِ طاغوت میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جائے:۔

ا۔صفحہ ۲۴۵۔

جنابِ امیرؑ المومنین فرماتے ہیں کہ ایک روز میں بیرونِ کوفہ کی طرف جا رہا تھا اور قنبرؓ میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس وقت ابلیس میرے سامنے آیا۔ میں نے اس سے کہا ''تو بہت برا بوڑھا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''یا امیرؑ المومنین! آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں؟۔ خدا کی قسم میں آپ کیلئے ایک حدیث نقل کرتا ہوں جو میں نے اللہ تعالیٰ سے بغیر کسی واسطے کے براہِ راست سنی ہے۔ اس وقت میں اپنے گناہ کیلئے چوتھے آسمان پر اترا ہوا تھا کہ میں نے صدا دی کہ میرے خدا! اے میرے مالک! میرا گمان یہ ہے کہ تو نے مجھ سے زیادہ شقی کوئی بھی مخلوق پیدا نہ کی ہوگی۔ اللہ نے مجھے اس طرح وحی کی۔ ''بے شک میں نے تجھ سے زیادہ شقی کو خلق کیا ہے۔ داروغۂ جہنم کے پاس جا کہ

وہ تیرے لئے اس کی نشاندہی کرے"۔

۲۔صفحہ ۲۴۴۔

سلیم بن قیس جناب سلمانؓ سے روایت کرتے ہیں جب روزِ محشر برپا ہوگا تو ابلیس کو ایک آتشیں لگام لگا کر لایا جائے گا اور "زُفر" کو دو آتشیں لگامیں لگا کر لایا جائے گا۔ (یہ لفظِ "زُفر" ایک کنایہ ہے جس کے حقیقی معنی کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں جس کیلئے بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۲۲۳ اور جلد ۷ ۳صفحہ ۱۱۹ کیطرف رجوع کیا جائے)۔ ابلیس اُس کے پاس جائے گا اور فریاد کرے گا اور کہے گا۔ "تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے، تو کون ہے؟۔ میں تو وہ ہستی ہوں جس نے اوّلین و آخرین کو گمراہ کیا پھر بھی مجھے ایک آتشیں لگام لگا کر لایا گیا ہے جبکہ تجھے دو لگامیں لگائی گئی ہیں"۔ اس پر وہ (زُفر) کہے گا کہ میں وہ ہستی ہوں کہ جب میں نے حکم دیا تو اس کی اطاعت کی گئی اور جب اللہ نے حکم دیا تو اس کی نافرمانی کی گئی"۔

ابلیس کے مطالبات

جب ابلیس کو دھتکارا اور نکالا گیا تو اس وقت تک وہ یہ طے کر چکا تھا کہ اب اسے باطل کا نمائندہ بن کر رہنا ہے اور اس کیلئے اسے کچھ طاقتوں، کچھ اختیارات اور ایک طویل مدّت کی ضرورت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ بہر حال ملے گا تو اسی سے جس سے اس نے بغاوت کی تھی چنانچہ اس نے اپنے مطالبات کی فہرست نکالی اور رحمٰن کی بارگاہ میں کھڑا ہو گیا۔

تفسیر صافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جب اللہ نے ابلیس کو نکل جانے کا حکم دیا تو اس نے کہا۔ ''خداوندا! تو عادل ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ کیا میرے عمل کا سارا ثواب باطل ہو جائے گا؟'' فرمایا۔ ''نہیں۔ تو امرِ دنیا سے ثواب کے بدلے جو چاہے مانگ لے، میں تجھے دوں گا''۔

ا۔ پہلی چیز جو اس نے مانگی وہ قیامت تک کی زندگی تھی۔ اللہ نے اسے وقتِ معلوم تک مہلت دے دی۔

۲۔ پھر وہ بولا۔ ''مجھے اولادِ آدمؑ پر تسلط دے''۔ فرمایا۔ ''میں نے مسلط کر دیا''۔

۳۔ پھر اس نے کہا۔ ''رگوں میں جس طرح خون چلتا ہے اُس طرح میں سرایت کر سکوں''۔

فرمایا۔ ''یہ بھی منظور ہے''۔

۴۔ عرض کی۔ ''جب ان کے یہاں بچہ پیدا ہو تو میرے یہاں دو پیدا ہوں''۔

یہ درخواست بھی منظور ہوئی۔

۵۔ پھر کہا ''میں ان کو دیکھوں اور وہ مجھے نہ دیکھیں''۔ یہ مطالبہ بھی قبول ہوا۔

٦۔ پھر بولا۔ ''اور مجھے یہ اختیار بھی ہو کہ میں جس صورت میں چاہوں اُن کے سامنے آ سکوں''۔

یہ درخواست بھی مان لی گئی اور اللہ نے فرمایا کہ ''میں نے یہ سب کچھ عطا کیا''۔

۷۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''اے پروردگار کچھ اور بھی دے''۔ فرمایا۔ ''میں نے تیرا اور تیری اولاد کا اُن کے سینے میں ٹھکانا قرار دیا''۔ اُس وقت اس نے کہا کہ بس! اب

کافی ہے۔

ہمزاد

اپنے چوتھے مطالبے میں ابلیس نے کہا تھا کہ جب انسان کے یہاں ایک بچہ پیدا ہو تو میرے یہاں دو بچے پیدا ہوں۔ چنانچہ انسان کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ دو جنّات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں ہمزاد کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں انسان کی پیدائش سے لیکر اُس کی موت تک اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور اسے گمراہ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اب آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کا کام کتنا مشکل ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے کی جنگ ہے اور اگر ایک لمحے کیلئے بھی آپ غافل ہوئے تو وہ اپنا کام کر جائیں گے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اصل کفر غفلت ہے اور اسی لئے اللہ دن میں کم از کم دس مرتبہ آپ سے دعا کراتا ہے کہ "پروردگار ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ"۔

یہ ہمزاد تو رہے ایک طرف، لیکن بہت سے جنّات ہیں جو انسانی شکل میں پھرتے رہتے ہیں اور آپ انہیں انسان سمجھ کر ان سے ملتے ہیں، ان سے دوستیاں کرتے ہیں، ان سے باتیں کرتے ہیں، ان کی باتیں سنتے ہیں اور بعض اوقات ان سے متاثر ہو کر ان کی راہ کو اپنا لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان سے اتنا متاثر ہو جاتے ہیں کہ خود کو ان کے حوالے کر دیتے ہیں اور ان کی ہر بات کو بے چوں و چرا تسلیم کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اپنی بات کی توثیق کیلئے ہم القطرہ من بحار جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ سے ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس میں

ابلیس جنابِ امیرؑ المومنین سے کہتا ہے۔ ''خدا کی قسم آپ سے کوئی دشمنی نہیں کرے گا مگر یہ کہ اس کے باپ کے نطفے سے پہلے میرا نطفہ اس کی ماں کے رحم میں گیا ہوگا''۔ اب ایک جن کے نطفے سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ جن ہی ہوگا لیکن چونکہ اس کی ماں انسانیہ ہے اسلئے اس کی شکل وصورت اور جسم وجسمانیت انسانوں جیسی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو وہی پہچان سکتا ہے جو ان کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور یہی ہماری خواہش بھی ہے اور کوشش بھی کہ مومنین کی آنکھوں میں وہ پرکھ پیدا ہو جائے جو ایسے لوگوں کو پہچان سکے۔ ایسے لوگوں کا توڑ یہ ہے کہ انسان یہ عادت ڈال لے کہ نہ تو بغیر دلیل کسی کی بات مانے اور نہ بغیر دلیل اپنی بات کسی سے منوائے ایسی صورت میں وہ شخص جب پہلا وار کرے گا تو وہیں مات کھا جائے گا کیونکہ ایسے لوگوں کے پاس صرف دعوے ہوتے ہیں، دلیل نہیں ہوا کرتی۔

ابلیس کا دوسرا روپ

ہم ابلیس کی ابتداء، اس کی طاقتیں اور وہ رول بیان کر چکے جو اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ ادا کیا لیکن جب وہ دنیا میں آیا تو اب اسے اپنے مرتّب کردہ منصوبوں کو عملی صورت دینی تھی اس لئے اس نے اب ایک نیا روپ اختیار کیا جس کا نام شیطان تھا اور ابلیس کی اسی روپ کی ذمہ داری تھی کہ ابلیس کے تمام منصوبوں کو بروئے عمل لائے اور اس مقصد کیلئے ایک پورا نیٹ ورک تشکیل دے۔ اس کو آسان الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ابلیس کی قوتِ نافذہ کا نام شیطان ہے۔ اس سلسلے کی بنیادی کڑی

ابلیس ہے لیکن مرکزی کڑی شیطان ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ لوگوں کی اکثریت اس کو سمجھنے میں غلطی کرتی ہے اور اسی لئے زندگی بھر "**اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم**" پڑھتے پڑھتے ان کی زبانیں خشک ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی ساری عمر گمراہی میں گزار دیتے ہیں بلکہ بعض مراحل میں خود بھی شیطان بن جاتے ہیں۔ لوگ شیطان کو تمام ظاہری گناہوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں انسانوں سے سارے گناہ شیطان ہی کراتا ہے حالانکہ یہ بات سوچنے کی ہے کہ شیطان کا پروگرام شیطان خود طے کرے گا یا لوگ طے کریں گے؟۔ اپنا مقصد اور اپنا ہدف وہ خود بہتر جانتا ہے یا لوگ؟ ۔لہٰذا دانشمندی یہی ہے کہ شیطان کا مقصد اور پروگرام خود اسی سے پوچھا جائے نہ کہ خود طے کیا جائے۔

یہ اچھی طرح جان لیجئے کہ ظاہری گناہوں، مثلاً شراب نوشی، زنا، جُوا، چوری، قتل یا اسی قسم کے دیگر جرائم کا کوئی تعلق شیطان سے نہیں ہے بلکہ یہ انسانی نفس کی اپنی قوتیں ہیں جو گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں یا مختلف محرّکات کیوجہ سے ان میں بگاڑ پیدا ہوتا رہتا ہے اور وہ راہِ اعتدال سے ہٹ کر گناہ کر بیٹھتا ہے اور ایسے گناہوں کے تدارک کیلئے اللہ نے آپ کو ایک ہتھیار دے رکھا ہے اور وہ ہے توبہ۔ اگر گناہ کے بعد انسان شرمندہ ہو اور صدقِ دل سے توبہ کرے اور معافی مانگے تو اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ سارے گناہ بخش دے گا۔ شیطان اتنا باؤلا نہیں ہے کہ وہ آپ سے ایسے گناہ کرائے جو بخشے جائیں اور اس طرح اس کی زندگی بھر کی محنت پر ایک لمحے میں پانی پھر جائے۔ وہ تو

ایسا گناہ کراتا ہے جو نا قابلِ معافی ہو اور جس کے ارتکاب کیوجہ سے انسان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں۔ شیطان کا مقصدِ اصلی لوگوں سے گناہ کرانا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل ہدف لوگوں کو اہلبیتؑ سے غافل کرنا ہے۔ اگر وہ شراب سے غافل ہوتے ہیں تو وہ شراب پلا دے گا۔ اگر جوئے اور قتل سے غافل ہوتے ہیں تو وہ یہ کام کرا دے گا۔ اگر وہ ظاہری عبادات سے غافل ہوتے ہیں تو وہ ان کو ان کاموں میں لگا دے گا اور اسی لئے شریعت نے گناہوں سے روکا ہے تا کہ انسان کسی بھی لمحے اہلبیتؑ سے غافل نہ ہو پائے۔

آیئے خود شیطان ہی سے پوچھتے ہیں کہ وہ اللہ کو کیا چیلنج دے کر آیا تھا اور اُس پر عمل درآمد اس نے کیسے کیا؟

اعراف ١٦۔

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

(شیطان نے) کہا۔ ''چونکہ تو نے مجھے نا امید کر دیا، میں بھی تیرے صراطِ مستقیم پر ان سب کیلئے (راستہ مارنے) بیٹھ جاؤں گا''۔

یہ تھا وہ چیلنج جو وہ اللہ کو دے کر نکلا تھا۔ اب اس کا مقصد کیا تھا اور اپنا مقصد وہ کس طرح حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اسی سورے کی آیت ١٧ میں بیان کیا گیا ہے:۔

﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾

''پھر میں ان کے پاس (ان کے) آگے سے، اور ان کے پیچھے سے، اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ضرور آؤں گا اور تو ان کی اکثریت کو شکرگزار نہ پائے گا''۔

چلیئے پتہ چل گیا کہ شیطان کا مشن کیا ہے اور وہ اس پر عمل درآمد کیسے کرتا ہے۔

مشن اس کا یہ ہے کہ:۔

ا۔صراطِ مستقیم کو پہچاننا۔لیکن جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب ''کشف المودّہ'' میں عرض کیا تھا کہ معرفت کی بنیاد اگر محبت نہ ہو تو یہی معرفت حسد کو جنم دیتی ہے۔شیطانِ رجیم نے بھی جب صراطِ مستقیم کو پہچانا تو اس کے دل میں آتشِ حسد بھڑک اٹھی اور اس نے اس کی مخالفت کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔

۲۔صراط مستقیم پر رہزن بن کر بیٹھ جانا تا کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور آگے جانے ہی نہ دے اور وہ کس طرح یہ کام کرتا ہے، یہ ہم آئندہ صفحات میں عرض کریں گے۔لیکن یہ جان لیں کہ شیطان ڈریکولا کیطرح ہے کہ جس طرح وہ کسی کا خون پی لے تو اسے بھی ڈریکولا بنادیتا ہے اور اس طرح ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جاتی ہے، اُسی طرح شیطان بھی جسے ڈس لے تو اسے بھی شیطان بنادیتا ہے اور اس طرح شیاطین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے اسلیئے مومن کا کام بھی مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے کیونکہ اس کے دشمن کے لشکر میں اضافے کیوجہ سے اس کیلیئے اپنا دفاع مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔اسی لئے اللہ نے اعراف ۸۶ میں لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ

حق کے متلاشیوں اور ان کے ہادی (صراط مستقیم) کے درمیان حائل نہ ہوں۔
آپ کوئی بھی شیعہ تفسیر اٹھا کر دیکھ لیں۔ کچھ تفاسیر کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے اور کچھ کا ہونے والا ہے۔اس کے علاوہ قرآن کے مختلف ترجمے ہیں جیسے مولانا مقبول مرحوم کا ترجمہ یا "تفسیر المتقین" کے نام سے مولانا امداد حسین کاظمی مرحوم کا ترجمہ۔ ان کے حاشیے پر تفاسیرِ معصومینؑ درج ہیں۔ ہر مقام پر آپ دیکھیں گے کہ ہر معصومؑ نے "صراطِ مستقیم" کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد ولایتِ امیرؑ المومنین ہے۔ چنانچہ تفسیر المتقین میں اسی آیت کی تفسیر معصومؑ کی زبانی یوں نقل ہوئی ہے:۔
"تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ صراط سے مراد جناب علیؑ ہیں اور کافی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے زرارہ سے فرمایا۔" اے زرارہ! ابلیس کو صرف تمھاری اور تمھارے دوستوں کی فکر ہے۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ ان سے فارغ ہو چکا ہے"۔لہٰذا حدِّ یقین تک جان لیجئے کہ شیطان کا واحد مقصد لوگوں کو ولایتِ علیؑ سے ہٹانا اور اس سے غافل کرنا ہے۔اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے اور اس مقصد پر وہ عمل کسطرح کرتا ہے وہ اس آیت میں بتایا گیا ہے جو ہم پہلے ہی نقل کر چکے ہیں یعنی اعراف ۱۷۔اسمیں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے اور غافل کرنے کا طریقہ جو شیطان نے خود بیان کیا وہ یہ ہے کہ وہ انسان کو ناشکرا بنا دے۔شکر نعمت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کی نعمت کی قدر نہ کرے اور اسے سبک جانے اور اللہ کی نعمتِ تامّہ کیا ہے یہ سورۂ مائدہ آیت ۳ میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے۔﴿اَلۡیَوۡمَ

اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ﴾۔ یہ آیت ''من کنت مولاہ فھٰذا علیٌ مولاہ'' کے فوراً بعد نازل ہوئی جس سے پتہ چلا کہ اللہ کی حقیقی نعمت جس کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ ولایت امیرؑ المومنین ہے اور شیطان کا کام اسی نعمت کو لوگوں کی نگاہوں میں سبک کرنا ہے کیونکہ صراطِ مستقیم پر وہی ثابت قدم رہ سکتا ہے جو اس کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ محض صراطِ مستقیم پر آجانے سے انسان محفوظ نہیں ہوجاتا۔ اس کام کیلئے وہ ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ آگے سے آنے کا مطلب یہ ہے وہ کسی ایسے روپ میں ظاہر ہو جو آپ کو بہت محبوب ہو۔ وہ غیرِ معصوم ہو مگر پھر بھی آپ اس کی بے چون و چرا اطاعت کرتے ہوں۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے یہ طریقہ شیطان کیلئے سب سے آسان ہے اور قیامت یہ ہے کہ خلقِ خدا کی اکثریت اسی علّت میں مبتلا ہے۔ پھر بھلا شیطان کا کام آسان کیوں نہ ہو!

پیچھے سے آنے کا مطلب غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وار کرنا ہے۔ اسی لئے ہم نے عرض کیا تھا کہ اصل کفر غفلت ہے۔ انسان جب اپنے مقصدِ حیات سے ناواقف ہو یا واقف تو ہو مگر امورِ دنیا میں اتنا منہمک ہوجائے کہ اُس مقصد سے غافل ہوجائے تو شیطان کیلئے یہ بہترین موقعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کام کرجائے اور انسان کو خبر بھی نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے تعقّل و تفکّر و تدبّر پر جو اتنا زور دیا ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان غافل نہ ہونے پائے اور حقیقتِ دین سے قریب تر ہوتا جائے۔ شیطان کے اس وار سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس کی مثال قطب نما (COMPASS) کی طرح ہو

کہ وہ خواہ کسی بھی کیفیت و حالت میں ہو مگر اس کے ذہن کی سُوئی اسے اپنے مقصد کیطرف متوجہ رکھے اور یہ چیز بیٹھے بٹھائے حاصل نہیں ہوجاتی بلکہ شعوری محنت و ریاضت سے ملتی ہے۔ جس کی رگوں میں خون کی بجائے کربلا و نجف گردش کرتے ہوں اس پر قابو پانا شیطان کیلئے ممکن نہیں رہتا اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ائمہ طاہرین نے فرمایا ہے کہ ''اللہ نے ہمارے شیعوں پر شیطان کو تسلّط نہیں دیا''۔ میں اپنے بیان کو سمیٹتے سمیٹتے تھک گیا ہوں کیونکہ میں کتاب کی مطلوبہ ضخامت کو بہر حال نظر میں رکھتا ہوں لیکن بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں وضاحت کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ یہاں بھی لفظِ شیعہ سے شدید غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان تھا اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی حقیقت بیان کردی جائے۔

شیعہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک پیدائشی شیعہ (Shia by birth) اور دوسرے تحقیقی شیعہ (Shia by option)۔ جو پیدائشی شیعہ ہوتا ہے اس پر بغیر ارادے یا کوشش کے شیعہ کا ٹھپّہ لگ جاتا ہے۔ وہ خود کو شیعہ کہنے لگتا ہے اور لوگ بھی اسے شیعہ سمجھنے لگتے ہیں لیکن اگر حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھا جائے تو ایسے شخص کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ چند رسومات جو اسے ورثے میں ملی ہوتی ہیں، وہ انہی کو مذہب سمجھتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک سنی جو کسی سنی گھر میں پیدا ہوجاتا ہے، ایک عیسائی جو کسی عیسائی گھر میں پیدا ہوجاتا ہے اور ایک ہندو جو کسی ہندو گھر میں پیدا ہوجاتا ہے۔ اور ایک شیعہ جو کسی شیعہ گھر میں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ سب حقیقت میں ایک ہوتے ہیں اور ان سب کو ایک ہی نام دیا جاسکتا ہے اور وہ ہے ''رسومات کا پجاری''۔ مولاؑ کی مراد ہرگز

ایسا شیعہ نہیں ہے بلکہ ایسے شیعوں میں شیاطین کی تعداد دیگر مذاہب کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔شیعہ ایک ارفع و اعلیٰ مقام ہے اور اس کے بہت سے درجات ہیں۔ اس کی بہت سی بنیادی شرائط ہیں جن کو پورا کئے بغیر انسان شیعہ نہیں بن سکتا۔مگر سب سے پہلے یہ جان لیجئے کہ شیعہ محض ایک نام نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے لہٰذا سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ انسان یہ جانے کہ مذہبِ شیعہ ہے کیا۔ یہ کہے سنے پر نہیں چلتا بلکہ تحقیق سے جانا جاتا ہے۔اب آپ وہ شرائط ملاحظہ فرمائیے جن کو پورا کئے بغیر کسی کو حق نہیں کہ خود کو شیعہ کہہ سکے:۔

۱۔اہلبیتؑ سے محبت

۲۔محبت میں شدت

۳۔ان کے دوست سے محبت

۴۔ان کے دشمن سے عداوت

۵۔ان کی معرفتِ مسلسل

۶۔اُن کے غیر سے دوری

۷۔ان کی غیر مشروط اطاعت

۸۔ان کی ولایت و اطاعت میں کسی کو شریک نہ کرنا

۹۔اور سب سے بڑھکر خلوص

یہ وہ کم سے کم شرائط ہیں جن کی بنا پر انسان شیعہ بن سکتا ہے ورنہ اگر میں شیعہ کی حقیقی صورت دکھلا دوں تو شاید ایک شخص بھی شیعہ ہونے کی جراءت نہ کرے بلکہ صرف

محب ہونے پر فخر کرے۔ یہاں میں صرف ایک حدیث پیش کررہا ہوں جس سے آپ سمجھ لیں گے کہ شیعہ کس قدر ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔

مشارق الانوار صفحہ ۲۴۲۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''یا علیؑ قیامت کے دن انبیاؑء تیرے شیعوں میں شمار ہوں گے''۔ آپ دیکھیں گے کہ اس حدیث میں آنحضرتؐ نے خود کو بھی دیگر انبیاؑء سے مستثنیٰ نہیں کیا لہٰذا مجھے کہنے دیجئے کہ علیؑ کے سب سے بڑے شیعہ خود رسولؐ اللہ ہیں۔ لہٰذا جتنے جتنے آپ علیؑ سے قریب تر ہوتے جائیں گے اتنے اتنے آپ شیعہ کہلائے جانے کے مستحق بنتے جائیں گے۔ یہ مذہب آپ کو علیؑ کی قربت سے ملے گا، مولوی کی قربت سے نہیں۔ کیونکہ مولوی کا تعلق شیطان کے اس شعبے سے ہے جہاں وہ اپنے کارکنوں کو شیعوں کی صفوں میں بظاہر شیعہ بنا کر داخل کرتا ہے اور حقیقی شیعہ انہیں اپنا بھائی سمجھ کر گلے سے لگا لیتے ہیں لیکن چونکہ وہ شیطان کے کارکن ہوتے ہیں اس لئے جلد یا بدیر اپنے مشن پر عمل شروع کردیتے ہیں اور ایمان کو شیعوں پر مشتبہ بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم کسی کے دعوے سن کر پسیج نہ جائیں بلکہ بہت جانچ کر اور پرکھ کر کسی کو شیعہ بھائی کہیں کیونکہ ایسے دعوے کرنے والوں کے بارے میں امام رضاؑ فرماتے ہیں:۔

''ہم اہلبیتؑ سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں میں کچھ ایسے ہیں جن کا فتنہ ہمارے شیعوں کیلئے دجال سے بھی سخت ہے''۔ (راوی کا بیان ہے) میں نے پوچھا: اے فرزندِ رسولؐ وہ کیسے؟۔ فرمایا۔ ''یہ لوگ وہ ہیں جو ہمارے دشمنوں سے محبت اور

ہمارے چاہنے والوں سے عداوت رکھتے ہیں اور جب ایسا ہو تو حق و باطل باہم خلط ملط ہو جائیں گے، معاملہ مشتبہ ہو جائے گا اور مومن و منافق کی پہچان نہیں ہو سکے گی''۔(شیعانِ اہل بیتؑ۔شیخ صدوق)

دائیں بائیں سے مراد یہ ہے کہ انسان کس صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔کیونکہ صحبت کا اثر لازماً ہوتا ہے۔صحبت ایسی چیز ہے جو شریف النسل لوگوں کو بھی کمینہ بنا دیتی ہے لٰہذا ہمارا فرض ہے کہ دوستوں کے انتخاب میں انتہائی احتیاط برتیں اور دنیا داروں کی صحبت سے خود کو بچائیں۔جیسا کہ اعتقاداتِ شیخ صدوق صفحہ ۱۰۴ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ ''جو شخص کسی ظالم سے بھائی چارہ قائم کرے وہ خود بھی ظالم ہے''۔صحبت وہی اچھی ہوتی ہے جس کی ابتداء بھی ''یا علیؑ مدد'' سے ہو اور انتہاء بھی ''یا علیؑ مدد'' پر ہو اور ان دونوں کا درمیانی وقفہ بھی اپنے محبوب کے ذکر میں گزرے۔جب علیؑ کی مدد شاملِ حال ہو اور ذکر بھی علیؑ کا ہو رہا ہو تو شیطان کی کیا مجال کہ وہاں دم بھی مار سکے۔اسی لئے کتاب شانِ علیؑ جلد ۲ صفحہ ۴۰۵ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔''سچے دل سے میرے دادا علیؑ کا نام لینا چھ مہینے کے اعتکاف، نماز اور روزے سے بہتر ہے''۔

ابلیس کا تیسرا روپ

ابلیس کے تیسرے روپ کا نام ''خنّاس'' ہے۔یہ وہ صورت ہے جب وہ نہ سامنے سے آتا ہے نہ پیچھے سے، دائیں سے آتا ہے نہ بائیں سے بلکہ براہِ راست دل پر القاء کرتا ہے جسے وسوسہ کہتے ہیں۔یہ ایک قسم کی ٹیلی پیتھی ہے جس میں پیغام رسانی کیلئے

زبان یا اشاروں سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ اپنے خیالات براہ راست دوسرے کے دل تک پہنچائے جاتے ہیں۔ شیطان کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ "Capture the Mind" یہ گمراہ کرنے کا انتہائی خطرناک طریقہ ہے۔ ایمان اور کفر کے درمیان تین چیزیں ہیں۔ وسوسہ، شبہ اور شک۔ خنّاس کا کام دل میں شبہ ڈالنا ہے جو انسان کو تذبذب میں مبتلا کر دیتا ہے یعنی وہ وقتی طور پر قوتِ فیصلہ سے محروم ہو جاتا ہے اور حقیقت اس پر مشتبہ ہو جاتی ہے۔ شبہ اگر مومن کے دل میں جائے تو وسوسہ کہلاتا ہے اور اگر کافر کے دل میں جائے تو شک کہلاتا ہے کیونکہ کافر شبہ کو دور نہیں کرتا بلکہ اسے پالتا ہے یہاں تک کہ وہ پہلے شک اور آخر کار کفر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تفسیرِ صافی صفحہ ۵۴۰ پر مرقوم ہے کہ خنّاس شیطان کا نام ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں ''ہر نیکی کے کام کو تاخیر میں ڈالنے والا''۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کی قوت فیصلہ مفلوج ہو جائے گی تو وہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہے گا کہ یہ کام کروں یا نہ کروں؟ اور اس طرح نیکی کے کاموں میں تاخیر ہوتی رہے گی۔ اصولِ کافی جلد پنجم باب ۱۵۳ حدیث ۵ میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''ایک شخص نے رسولؐ اللہ سے کہا کہ میں منافق ہو گیا۔ فرمایا۔ ''تو منافق نہیں، اگر منافق ہوتا تو میرے پاس نہ آتا۔ بتا تیری کیا رائے ہے؟۔ میں گمان کرتا ہوں کہ تیرا حاضر دشمن تیرے پاس آیا اور تجھ سے پوچھا کہ تیرا خالق کون ہے؟۔ تو نے کہا کہ ''اللہ'' اس نے کہا ''اللہ'' کا خالق کون ہے؟۔ یہی وسوسہ ہے نا؟''۔ اس نے کہا۔ ''بے شک یہی ہے''۔ فرمایا ''شیطان تمھارے پاس اعمال سے پہلے آتا ہے اور جب دسترس نہیں پاتا تو اِس طریقے سے تمھیں بہکاتا

ہے۔(یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ وسوسے کا تعلق اعمال سے نہیں بلکہ عقیدے سے ہے اس لئے انسان کا فرض ہے کہ پہلے وہ اپنا عقیدہ درست کرے اس کے بعد عمل کرنے کا ارادہ کرے نہ کہ ناقص عقیدے کے ساتھ عمل میں لگا رہے) جب ایسا ہو تو تم خدائے واحد کا ذکر کیا کرو"۔ ذکر اللہ کے بارے میں ہم نے اپنی کتاب کشف المعارف میں تفصیل سے لکھا ہے جس کا اعادہ ضروری نہیں۔ اتنا کافی ہے کہ ذکر اللہ میرا مولا علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہے۔

چونکہ وسوسہ ایک خطرناک شے ہے اس لئے اللہ نے اِس مشکل میں ہمیں تنہا نہیں چھوڑا بلکہ ہماری مدد کیلئے ایک شے رکھدی جسے "الہام کہتے ہیں۔ سورۃِ المجادلہ کی آیت ۲۲ ﴿وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ "اور ان کی مدد اپنی ایک روح سے کی"۔ مولا امام جعفر صادقؑ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "ہر مومن کے دل میں دو کان ہیں۔ ایک میں تو خنّاس وسوسے پھونکتا رہتا ہے اور ایک میں فرشتہ اپنی آواز پہنچاتا رہتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس مومن کی فرشتے کے ذریعے تائید کرتا رہتا ہے۔" یہ واضح رہے کہ یہ مدد ہمارے زمانے کا امامؑ کرتا ہے۔ پس جو ان کیطرف متوجہ ہے وہ اس آواز کو سنتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے اور جو اُنؑ سے غافل ہے وہ بہرا بنا رہتا ہے اور اس طرح شیطان اس پر قابو پالیتا ہے۔ مشارق الانوار صفحہ ۲۶۰ پر حافظ رجب علی برسی لکھتے ہیں کہ "خنّاس روزانہ ۳۲۰ مرتبہ مومن کے قلب پر گمراہ کن وسواس کا ہجوم کرتا ہے"۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ مومن کا کام کتنا مشکل ہے۔ اس کے پاس تو غافل ہونے کیلئے وقت ہے ہی نہیں۔

شیطان کا چوتھا اور پانچواں روپ

ابلیس کے یہ دو روپ ہم نے اس لئے ایک جگہ جمع کئے ہیں کہ ان دونوں کی نوعیت ایک جیسی ہے، صرف اختیارات کا فرق ہے۔ ایک روپ کا نام ہے طاغوت اور دوسرے کا جبت۔ اللہ نے بھی ان دونوں کا ذکر ایک مقام پر ایک ساتھ ہی کیا ہے۔ جیسا کہ نساء ۵۱ میں ارشاد ہوا۔ ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا۔ وہ جبت اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں''۔ یہ دونوں یعنی طاغوت اور جبت ابلیس کے خطرناک ترین روپ ہیں اور مومنین کیلئے انتہائی مہلک۔

طاغوت

شیطان جو ہم پر وار کرتا ہے وہ اپنی پوشیدہ قوتوں کے ساتھ کرتا ہے اور اگر انسان کی قوتِ ارادی مضبوط ہو اور توفیقِ خداوندی اس کے شاملِ حال ہو تو وہ ایسے حملوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس پر زبردستی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن طاغوت ابلیس کا وہ روپ ہے جہاں اسے ظاہری حکومت بھی مل جاتی ہے اور وہ ظلم، طاقت اور جبر کے ساتھ لوگوں سے اپنے پروگرام پر عمل کراتا ہی سورۂ طٰہٰ ۴۳ اور دیگر آیات میں فرعون کو بھی اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ مومن کیلئے مشکل ترین دور ہوتا ہے کیوں اسے دو مکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ اندرونی وساوس کے خلاف بھی اسے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور بیرونی ظلم وتشدد کی چکّی میں بھی پسنا پڑتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب مومنین کا خون بہایا جاتا ہے، ان کا مال لوٹا جاتا ہے، اُن کا حق غصب کیا جاتا

ہے، اُن پر جبر کیا جاتا ہے اور اُنہیں طرح طرح کی اذیّتیں دی جاتی ہیں جن کو روکنے کی اُن میں طاقت نہیں ہوتی اور یہی وقت ہوتا ہے جب اُن کے ایمان کے اخلاص کو آزمایا جاتا ہے اور کیا ہی خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اِس دَورِ ابتلاء سے کامیاب و کامران گزر جاتے ہیں جیسا کہ زمر ۱۷ میں ارشاد ہوا۔﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ﴾ ''اور جو لوگ طاغوت سے بچے رہے کہ اس کی عبادت کریں اور انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا ان کیلئے خوش خبری ہے۔ پس تو میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دے''۔

کلمۂ طاغوت صیغۂ مبالغہ ہے جس کی جمع طواغیت ہے اور اس کا مادّہ طغیان ہے جس کے معنی ہیں بغاوت۔ یہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے خاص طور پر گمراہ کرنے والا رہبر، ظالم حکمران اور بے مہار۔

علامہ یعسوب الدین رستگار نے اپنی کتاب ''حقیقتِ وحدت در دین و حکمتِ عید الزہراء'' کے صفحہ ۳۳ پر ہمارے موقف کی تائید کی ہے اور لکھا ہے۔ ''قرآنِ کریم میں طاغوت ایسے حاکم اور فرمانرواں کے معنی میں آیا ہے جو باغی اور فسادی ہو' اور اسی کتاب کے صفحہ ۳۲ پر لکھا ہے کہ ''تفسیرِ قمی میں طاغوت سے مراد وہ ہیں جنہوں نے آلِ محمدؐ کا حق غصب کیا اور ''وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے ولی طاغوت ہیں'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے آلِ محمدؐ پر ظلم کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ایسے لوگوں کی پیروی کی (چاہے وہ کسی بھی زمانے میں ہوں)''۔ اسی لئے رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"یا علیؑ! اس کا بیڑہ غرق ہو جو تیرے بدلے کسی اور کو اپنا رہبر بنا لے یا تیری ولایت کو ماننے والے سے دشمنی رکھے۔ (مشارق الانوار صفحہ ۴۳، ۴۴) حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے سورۂ یوسف میں صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ "حکومت نہیں ہے مگر اللہ کیلئے" اس طرح حکومت صرف اس خلیفۃ اللہ کا حق ہے جو منجانب اللہ ہو۔ اُس کا حق غصب کر کے جو بھی کرسیٔ اقتدار پر قبضہ کرے گا وہی طاغوت کہلائے گا جیسا کہ مشارق الانوار صفحہ ۵۲ پر امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا۔ "ہماری جگہ اللہ کے پہلو میں ہے۔ ہم بندوں کے آقا اور شہروں کے منتظم ہیں۔ ہم صراطِ مستقیم ہیں۔ ہم عین الوجود ہیں۔ جو ہمارے حق کو نہیں مانتا، اللہ اس کا کوئی عمل قبول نہیں کرتا"۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں عالم و جاہل، مومن و کافر اور شیعہ اور غیر شیعہ کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ جو بھی حاکمیتِ معصومؑ کو چیلنج کرے گا وہی طاغوت ہوگا کیونکہ شیعہ ان بکھیڑوں میں نہیں پڑا کرتا جیسا کہ مشارق الانوار صفحہ ۴۴ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ "یا علیؑ! یہ دنیا تیرے شیعوں کیلئے نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کا غم پالتے ہیں"۔ طاغوت اور جبت کا توڑ تقیّہ ہے جس کے ذریعے مومن اپنے ایمان کی حفاظت کر سکتا ہے۔

آپ یقین فرمائیں کہ اس موضوع پر احادیث کا ایک ڈھیر ہمارے سامنے موجود ہے اور اگر ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھتے تو وہ احادیث بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے۔ یہاں ہم نے صرف اتنے پر ہی اکتفا کیا ہے جس سے طاغوت کا ایک خاکہ آپ کے ذہن میں آجائے اور ہم سمجھتے ہیں کہ عقلمندوں کیلئے اتنا کافی ہے۔
اس گفتگو کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے ہم سورۂ نساء کی آیات ۵۱ تا ۵۳ نقل کر رہے ہیں۔ آیت ۵۱ ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں لیکن بیان کا تسلسل قائم رکھنے کیلئے اب اسی

کو آیت ۵۲ اور ۵۳ کے ساتھ ملا کر نقل کر رہے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰۤىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾﴾ ''کیا تم نے ان لوگوں کیطرف نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا حصہ دیا گیا۔ وہ جبت اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں اور جو کافر ہو گئے ان سے کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں سے جو ایمان لائے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے پھر تم اس کا ہرگز کسی کو مددکرنے والا نہ پاؤ گے۔ کیا ان کیلئے سلطنت میں کچھ حصہ ہے؟۔ (اگر ہے) تو وہ لوگوں کو کھجور کی گھٹلی کے شگاف بھر (بھی) نہ دیں گے''

اس کے بعد اللہ بتاتا ہے کہ سلطنت کس کیلئے ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ ''کیا وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے؟۔ یقیناً ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت عطا فرمائی اور انہیں ایک بہت بڑی سلطنت دی''۔

یہاں تک طاغوت کی بات تھی۔ رہا جبت کا معاملہ تو جبت کے لغوی معنی ہیں ''بت''۔ ہماری گفتگو کے تسلسل میں اگر دیکھا جائے تو کہا جائے گا ''کٹھ پتلی حکمران''۔ یعنی ایک ایسا دکھاوے کا حکمران جسے طاغوت اپنے ہاتھوں سے بنائے اور اسے سامنے رکھے تاکہ لوگ اسے حکمران سمجھیں لیکن خود پیچھے رہ کر حکمرانی کرے۔ یعنی اصل حکمران

طاغوت ہو اور دکھاوے کا حکمران جبت ہو۔ ایسی مثالیں دنیا میں آپ کو بہت سی مل جائیں گی اور گھروں سے لیکر اقتدار کے ایوانوں تک ایسے مناظر آپ دیکھ سکیں گے۔ امیر المومنینؑ نے بھی دو اشخاص کو جبت اور طاغوت کے نام سے یاد کیا تھا۔

طریقۂ واردات

شیطان کا مقصد انسان کی عاقبت خراب کرنا ہے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کے دین کو برباد کرے۔ امورِ دنیا سے اسے کوئی مطلب نہیں۔ آپ کیا کھاتے ہیں، کیا پہنتے ہیں اس سے اُسے کوئی غرض نہیں۔ البتہ وہ یہ ضرور کرتا ہے کہ دنیا کو سجا کر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے تا کہ آپ دنیا کی رنگینیوں میں ہی کھو کر رہ جائیں اور آخرت کو فراموش کر بیٹھیں۔ لہٰذا اُس کا میدانِ عمل دین ہے اسی لئے وہ جب بھی کسی کے سامنے آیا ہے تو کسی اوباش، بدمعاش، شرابی یا جُواری کی شکل میں نہیں آیا بلکہ ہمیشہ ایک مقدس بزرگ کی شکل میں آیا ہے جس کی پیشانی پر سجدوں کے غیر معمولی نشانات پڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کو اپنے جال میں پھانسنے کا بہترین اور مجرّب نسخہ ہے جن کے دل میں دین کیلئے تھوڑی سی بھی گنجائش ہو۔

اطاعت

اگر آپ تھوڑی سی بھی توجہ فرمائیں تو جان لیں گے کہ دین کا اصل مقصد اطاعتِ خدا ہے۔ اللہ خود کسی کی اطاعت نہیں کرتا جبکہ تمام مخلوق اس کی اطاعت کی مکلّف ہے اور چونکہ یہ اطاعت غیر مشروط ہوا کرتی ہے اس لئے اسی اطاعت کا نام عبادت ہے۔

شیطان کا حتمی منصوبہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی اطاعت سے ہٹا کر ان سے اپنی اطاعت کروائے۔ وہ چونکہ ایک مدت تک فرشتوں کی محفل میں بیٹھا تھا اسلئے اللہ کے طریقۂ کار سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اللہ یہ کام اپنی حجتوں کے ذریعے کراتا ہے لہٰذا سب سے پہلا کام اس نے یہی طے کیا کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ کی حجتوں کی دشمنی ڈال دے اور ان کی جگہ اپنے کارندوں کی محبت پیدا کردے جو اسی کیطرح ایک مقدس اور عبادت گزار کی شکل میں لوگوں کے پاس جائیں۔ پہلے ان پر اپنی پارسائی کی دھاک بٹھا کر ان کو خود سے مانوس کریں یہاں تک کہ وہ اس کی ہر بات بلا چوں و چرا ماننے لگیں۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع توحید ہے اس لئے ضمناً ایک جملہ عرض کرتا چلوں کہ شیطان کا موثر ترین ہتھیار یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کردے کہ اَن دیکھے خدا کی پرستش کرنا حماقت ہے بلکہ ایسے خدا کی اطاعت وعبادت کرنی چاہیئے جو ظاہر بظاہر نظر آتا ہو۔ اس جملے کو یاد رکھیئے گا کیونکہ آئندہ بیان کے دوران یہ جملہ کلیدی کردار ادا کرے گا اور آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ اسی نظریے کی بنیاد پر اس نے خلقِ خدا کو گمراہ کیا ہے۔

عقیدہ اور عمل

دین کے دو شعبے ہیں۔ عقیدہ اور عمل اور یہی دو چیزیں شیطان کا ہدف تھیں مگر وہ جہاں دیدہ شخص تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنے کام کی ابتداء کہاں سے کرے۔ سو اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے کام کی ابتداء عمل سے کرے کیونکہ شاید یہ بات انسان کی فطرت میں ہے

کہ وہ عقیدے کی گہرائیوں اور باریکیوں سے گھبراتا ہے اور عمل کا بڑا شوقین ہوتا ہے کیونکہ عمل بہت جلد عادت بن جاتا ہے اور پھر وہ زندگی بھر اپنی عادت کی تسکین کر کر کے خوش ہوتا رہتا ہے اور اُس دن تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب سجدے کے نشانات اس کی پیشانی پر نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ اور رگڑ رگڑ کر سجدے کرنے لگتا ہے تا کہ یہ نشانات اور بھی زیادہ گہرے ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں سمجھنے، غور کرنے اور مغز ماری سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے، اور کس کی اطاعت میں کر رہا ہے اور جو کچھ کر رہا ہے اس کا اصل مقصد کیا ہے، ان تمام بکھیڑوں سے اسے نجات مل جاتی ہے حالانکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو فوراً پتہ چل جائے کہ عمل اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ یہ عمل کس کی اطاعت میں کیا جارہا ہے۔ مثلاً مرد وعورت کے دو جوڑے ہیں جو مصروفِ مباشرت ہیں۔ ان میں سے ایک جوڑا ایک دوسرے کا منکوحہ ہے جبکہ دوسرا جوڑا غیر منکوحہ۔ عمل وہ ایک ہی کر رہے ہیں مگر پہلے جوڑے سے جو بچہ ہوگا وہ حلالی ہوگا اور دوسرے جوڑے سے جو بچہ ہوگا وہ حرامی ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جب دونوں نے ایک ہی عمل کیا تھا تو پھر اتنا بڑا فرق کیسے پڑ گیا؟۔ بات صرف اتنی تھی کہ پہلا جوڑا جو عمل کر رہا تھا وہ اللہ کی اطاعت میں کر رہا تھا اس لئے اس کا بچہ حلالی قرار پایا۔ اور دوسرا جوڑا جو عمل کر رہا تھا وہ اپنے نفس کی اطاعت میں کر رہا تھا اس لئے اس کا بچہ حرامی کہلایا۔

مقصد یہ ہے کہ جنونِ عمل میں ان تمام چیزوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے البتہ بھاگ دوڑ

بہت نظر آتی ہے جس سے صحت بھی بہتر رہتی ہے اور لوگ بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام سے انسان بہت خوش رہتا ہے اور شیطان نے سب سے پہلے انسان کی اسی کمزوری کو پکڑا اور تفہیمِ عبادت سے بے خبری نے شیطان کے کام کو اور بھی زیادہ آسان بنا دیا۔ اب اُس نے کام تو وہی کرائے جو انسان پہلے سے کر رہا تھا لیکن بس اس کے ذہن سے یہ بات محو کرا دی کہ وہ یہ سارے کام کس کی اطاعت میں کر رہا ہے۔ میں گزشتہ امتوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ کتاب کی ضخامت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں ابتدا کروں گا مسلمانوں سے جو اطاعتِ شیطان میں گزشتہ تمام امتوں پر بازی لے گئے۔ آج اگر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا لگے گا کہ ہم ابلیس کی سرگزشت پڑھ رہے ہیں اور اگر ہم ابتداء ہی سے مسلمانوں کا طرزِ معاشرت دیکھیں تو یوں محسوس ہوگا کہ ہم شیطان کے ہیڈ کوارٹر کی سیر کر رہے ہیں۔

اس سے قبل آپ ابلیسِ بزرگ کا وہ جملہ سن چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا۔ ''میں وہ ہوں کہ جب میں نے حکم دیا تو اس کی اطاعت کی گئی اور جب اللہ نے حکم دیا تو اس کی نافرمانی کی گئی''۔ اِس ابلیسِ بزرگ کا تعلق کسی اور ملّت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے گروہ سے تھا جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان کس کی اطاعت کر رہے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اس زرّیں اصول کو یاد رکھیئے کہ انسان جب معصومؑ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ عبادتِ خدا ہوتی ہے اور جب کسی غیرِ معصوم کی ذاتی رائے کی اطاعت کرتا ہے تو وہ عبادتِ شیطان ہوتی ہے۔

یہاں چونکہ ذکر مسلمانوں کا ہو رہا ہے اس لئے شیطان کے لائحہ عمل کو بھی ہم مسلمانوں کے تناظر میں ہی دیکھیں گے۔ شیطان کا مقصد بہر حال اللہ کی نافرمانی اور اپنی اطاعت کرانی تھی اسلئے سب سے پہلے تو اس نے مرکزِ اطاعت کو توڑا، جو اطاعت کے حقدار تھے انہیں گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا اور جب میدان بالکل صاف ہو گیا تو اس نے طاغوت کا روپ دھارا اور احکامِ خدا و رسولؐ کو پسِ پشت ڈالکر اپنی ذاتی شریعت رائج کر دی جو آج تک رائج ہے۔ جب اپنے زمانے سے فارغ ہوا تو مستقبل کی فکر ہوئی اور اس نے اپنے منصوبے کے مطابق ''نظامِ اجتہاد و تقلید'' رائج کیا جسمیں تمام امورِ شریعت کو اپنے قیاس، اپنی رائے اور اپنے گمان کی بنیاد پر طے کیا جانے لگا۔ یہ نظام مسلمانوں کو بہت بھایا کیونکہ اس میں اطاعتِ خدا اور رسولؐ کا عنصر شامل نہیں تھا اسلئے بہت سی آسانیاں میسر آ گئی تھیں۔ غیبتِ امامؑ کے بعد یہ وائرس شیعوں میں بھی گھس آیا کیونکہ یہاں بھی دنیا طلبوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ تین سو سال کی محنتِ شاقّہ کے بعد بالآخر ایک نظام کے طور پر اسے شیعوں میں بھی رائج کر دیا گیا اور اس طرح شیطان اپنے پہلے منصوبے میں کامیاب ہوا۔ اطاعتِ خدا و رسولؐ ایک قصّۂ پارینہ بن کر رہ گئی اور شیطان نے باقاعدہ اپنی اطاعت شروع کرا دی جو اس کا ہدف تھا۔ اس سلسلے میں اگر آپ مکمل تفصیلات جاننا چاہتے ہیں تو ہماری کتاب ''کشف الحقائق'' کا مطالعہ فرمائیے۔ انشاء اللہ آپ کی نگاہوں سے مکر و فریب کے سارے حجابات اٹھ جائیں گے۔ اس مقام پر ہم دو احادیث آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تا کہ معاملہ آپ پر واضح ہو جائے:۔

۱۔مشارق الانوار صفحہ ۵۳۲۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''میری امت دو مسئلوں میں اختلاف کرے گی ۔ایک تو حکومت کے لئے ایک دوسرے سے جنگ کریں گے۔متفرق ہو جائیں گے، گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ دوسرے کتابِ خدا اور سنتِ پیغمبرؐ پر اختلاف کریں گے اور اگر کوئی جدید مسئلہ پیش آئے گا تو گمان کریں گے کہ کتابِ خدا اور سنتِ پیغمبرؐ میں ان مسائل کا کوئی وجود نہیں ہے''۔

۲۔مشارق الانوار۔صفحہ ۵۳۳۔

''اس کے بعد عمر نے اپنے قاضیوں اور اپنے والیوں کو حکم دیا کہ ان امور میں (جو ان کے خیال میں قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہیں) خود نظر کریں اور خود کوشش کریں اور جس چیز کو اہم قرار دیں اس کی پیروی کریں۔تو اس کے کارکنان اور قاضیوں نے ایک معیّن مسئلے میں مختلف فیصلے کئے اور عمر نے ان سب کو صحیح قرار دیا''۔

یہ تو تھا عمل کا معاملہ اور اب ہم عقیدے کیطرف آتے ہیں

عقیدہ

عقیدے کے معاملے میں چونکہ مجتہد بالکل ناکارہ تھا اس لئے بات کچھ جمی نہیں اور اب شیطان نے دوسری راہ پکڑی۔اُس نے چند لوگوں کو منتخب کیا، ان کی داڑھیوں کو بڑھوایا اور بے ترتیب کیا۔سر کے بال بھی بے ترتیبانہ طور پر بڑھا دیئے گئے۔ گیروے رنگ کے کھردرے کپڑے ان کو پہنا دیئے گئے۔گلے میں مالا ڈال دی گئی

ہاتھ میں موٹے دانوں والی تسبیح پکڑا دی گئی اور اسطرح ایک خانقاہی نظام کی داغ بیل ڈالی گئی جہاں روحانیت اور معرفت کی آڑ میں اپنی پرستش کرائی جانے لگی۔ روحانی ترقی کیلئے اس میں تین مراحل مقرر کئے گئے۔ فنافی الشیخ، فنافی الرسولؐ اور فنافی اللہ۔ اس کا طریقۂ کار اس قدر پیچیدہ مگر دلکش بنا دیا گیا کہ شوقین مزاج لوگ گھر بار چھوڑ کر مرشد کے قدموں میں آپڑے اور اس کی ہدایت پر شدید ریاضتیں کرنے اور قبرستانوں میں چلّے کاٹنے کے بعد بھی اُن کی منزلِ آخر فنافی الشیخ ہی رہی اور اس طرح طوطے کی جان مرشد کے ہاتھ میں آگئی اور اب مرشد اس سے جو چاہے کرا سکتا ہے، خواہ وہ کسی کا قتل ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ لوگوں کو امامؑ کے نام پر بلاتے ہیں اور پھر اپنا غلام بنا لیتے ہیں، کوئی مولا امیرؑ المومنین کے نام پر دکان کھول کر بیٹھ جاتا ہے، کوئی حسینِؑ مظلوم کے نام پر لوگوں کو معرفتِ حسینؑ سے غافل کرتا ہے اور کوئی حضرتِ صاحب الزمانؑ کے نام پر لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا ہے اور پھر ان سے اپنی پرستش کراتا ہے۔ طاغوت کے ہاتھ میں یہ انتہائی مہلک ہتھیار ہے جس کا توڑ کوئی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کی غیبی امداد میسر آجائے کیونکہ مجتہد اگرچہ باطل ہے مگر وہ اپنے نظام کی تائید میں لنگڑی لولی ہی سہی مگر کوئی نہ کوئی دلیل ضرور رکھتا ہے۔ جسے بہ آسانی رد بھی کیا جاسکتا ہے اور انسان طاغوت کے جال سے خود کو آزاد کرا سکتا ہے لیکن مرشد کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی سوائے خوابوں اور مکاشفوں کے اور اگر کوئی شخص اس جال میں ایک مرتبہ پھنس گیا تو سمجھو وہ عمر بھر کیلئے مرشد کا قیدی بن گیا اور اس کیلئے اس جال کو توڑنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ حق و باطل کی پہچان دلیل سے ہوا کرتی ہے۔ جہاں

دلیل ہی نہ ہو وہاں اس پہچان کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔ البتہ کچھ بزرگ ہوتے ہیں جو اپنے مالک کے وفادار ہوتے ہیں۔ نہ وہ کسی کی بیعت کرتے ہیں اور نہ کسی سے بیعت لیتے ہیں اور نہ ہی ان کا مقصد خود کو منوانا ہوتا ہے اور نہ یہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان کا کام صرف ولایتِ علیؑ کی اشاعت اور عزادارئِ حسینؑ کا فروغ ہوتا ہے اور اس سے ان کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوتی لیکن اُن شعبدہ بازوں کی وجہ سے، جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا، ایسے نیک لوگ پسِ منظر میں چلے جاتے ہیں اور لوگ ان کی برکات سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔

طاغوت اپنا نیٹ ورک چلانے کیلئے یہی دو روپ اختیار کرتے ہیں جن کا تعارف ہم نے آپ سے کرا دیا۔ اب آپ خود بھی کوشش کریں اور اللہ سے بھی مدد طلب کریں کہ وہ آپ کو اِن دونوں جالوں سے محفوظ رکھے تا کہ آپ مقصدِ حیات کیطرف تندہی اور خلوص کے ساتھ قدم بڑھا سکیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ کی کوششوں میں خلوص شاملِ حال رہا تو آپ کے مولاؑ ضرور آپ کی مدد فرمائیں گے۔ شیطان کے ان حربوں سے محفوظ رہنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زبان پر علیؑ کا ذکر ہو، آنکھوں میں علیؑ کی صورت ہو، ذہن میں علیؑ کا تصور ہو اور دل میں علیؑ کی محبت ہو۔ شیطان کو بھگانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں۔

ہم نے کفر بالطاغوت کے بارے میں حسبِ استطاعت ضروری معلومات آپ تک پہنچا دیں تا کہ آپ کی توحید اور باقی عقائد خالص ہو جائیں اور ان میں طاغوت کی کدورت باقی نہ رہے۔ اور اب ہم ایمان باللہ یعنی توحید کیطرف توجہ کرتے ہیں۔

توحیدِ خالص

ہم نے ابتداءِ بیان میں ''کُنتُ کَنزاً مخفیا'' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا تھا۔ چونکہ بابِ توحید میں یہ حدیث ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ہم وہیں سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بچپن سے لیکر آج تک ہم نے ہزاروں مجالس سنی ہیں جن میں بڑے بڑے علماء کی تقاریر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتابوں کی ایک بڑی تعداد ہمارے مطالعے میں رہی ہے ان سب میں جہاں بھی اِس حدیثِ مبارکہ کا ذکر آیا تو یہی ترجمہ کیا گیا کہ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا''۔ حالانکہ عربی زبان کا ایک مبتدی طالبِ علم بھی جانتا ہے کہ ''مخفی'' صیغۂ مفعول ہے۔ جیسے ''مہدی'' یعنی ہدایت کیا ہوا۔ ''مَغوی'' یعنی اغوا کیا ہوا۔ ''مرضی'' یعنی جس سے راضی ہوا جائے وغیرہ۔ اس طرح ''مخفی کا ترجمہ ہوگا ''چُھپایا ہوا'' نہ کہ ''چُھپا ہوا''۔ کیونکہ ''چھپا ہوا'' کیلئے عربی میں جو لفظ ہے وہ ہے ''خفی''۔ ہم آج تک حیرت میں تھے کہ اتنے بڑے بڑے علماء جان بوجھ کر اس لفظ کا غلط ترجمہ کیوں کرتے ہیں۔ اب جا کر سمجھ میں آیا کہ اس کا واحد مقصد علیؑ سے فرار ہے کیونکہ ''چُھپا ہوا'' سنکر ذہن میں اللہ آتا ہے (حالانکہ یہ فراری جانتے ہیں کہ اللہ تصور میں نہیں آسکتا لہٰذا غلط ترجمہ کرنے سے اُن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا) جس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن اگر اس کا صحیح ترجمہ یعنی ''چُھپایا ہوا'' کریں گے تو اللہ درمیان سے نکل جائے گا اور کسی اور کو ماننا پڑے گا جسے اللہ نے چُھپایا ہوا تھا۔ پھر غضب یہ ہوگا کہ اُسے جسے اللہ نے چھپایا ہوا تھا خالقِ کُل ماننا پڑے گا کیونکہ پوری

حدیث یوں ہے کہ ''میں ایک چھپا یا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو خلق کیا''۔ اور یہ بھی ماننا پڑ جائے گا کہ اس کی مشیت اللہ کی مشیت ہے اور اللہ کی مشیت اس کی مشیت ہے کیونکہ اللہ نے چھپایا ہوا تھا اور اِس نے ظاہر ہونا چاہا تو اگر دونوں کی مشیت ایک نہ ہو تو تضاد ثابت ہوتا ہے یا پھر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی مشیت اللہ کی مشیت پر غالب آئی (معاذ اللہ)۔ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مقصدِ خلقت اللہ کی نہیں بلکہ اس کی معرفت حاصل کرنا ہے جسے اللہ نے چھپایا ہوا تھا۔ اتنی خوفناک باتیں کس سے برداشت ہوسکتی ہیں؟ تو پھر یہی بہتر سمجھا گیا کہ اس کا ترجمہ ''چھپا ہوا'' کردو ورنہ جان چھڑانا مشکل ہوجائے گا۔ لیکن اِن بے چاروں کو معلوم نہیں کہ علیؑ سے جان چھڑانا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ تم جس طرف بھی رخ کروگے، اللہ کے چہرے کو ہی پاؤ گے۔ ائمہؑ اطہار سے مسلسل احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ''ہم علمِ خدا میں رہتے تھے''۔ علم چونکہ صفتِ ذات ہے اسلئے یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ نے علیؑ کو اپنی ذات میں چھپایا ہوا تھا اور یہی مطلب ہے اس حدیثِ رسولؐ کا کہ ''علیؑ کو برا مت کہو وہ ذاتِ خدا میں ممسوس ہے''۔ علمِ خدا سے اس نے مشیت کے روپ میں احداث کیا اور مشیت ہی خلّاقِ کائنات ہے۔ اسی سے وہ تمام صفات ظاہر ہوئیں جو اُس ذاتِ لم یزال سے منسوب کی جاتی ہیں کیونکہ وہاں ''فعل'' نہیں ہے۔ اُس کا فعل وہی ہے جو اِس سے صادر ہوتا ہے لہٰذا خالق ہے تو یہ ہے، رازق ہے تو یہ ہے رحمٰن ہے تو یہ ہے اور رحیم ہے تو یہ ہے، واحد ہے تو یہ ہے اور اَحد ہے تو وہ بھی یہی ہے۔ ان باتوں کو بے عقل لوگ شرک کہتے ہیں حالانکہ شرک کبھی ذات میں نہیں ہوا کرتا

کیونکہ نہ وہاں فعل ہے نہ صفات۔ شرک ہوگا تو اسمیں ہوگا جو اس کی صفات و افعال کا امین ہے۔ اسی لئے رسولؐ اللہ نے حذیفہ سے فرمایا:۔

یاحذیفہ ان حجۃ اللہ علیکم بعدی علی بن ابی طالب الکفر بہ کفر باللہ والشرک بہ شرک باللہ والشک بہ شک فی اللہ والالحاد فیہ الحاد فی اللہ والانکار لہ انکار باللہ والایمان بہ ایمان باللہ لانہ أخو رسول اللہ ووصیہ وإمام امتہ ومولاھم وھو حبل اللہ المتین

اے حذیفہ میرے بعد تم پر اللہ کی حجت علیؑ ہیں ان سے کفر کرنا اللہ سے کفر کرنا ہے ان سے شرک کرنا اللہ سے شرک کرنا ہے ان میں شک کرنا اللہ میں شک کرنا ہے، ان میں الحاد کرنا اللہ میں الحاد کرنا ہے، ان کا انکار کرنا اللہ کا انکار کرنا ہے اور ان پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانا ہے۔ علیؑ رسولؐ کا بھائی اس کا وصی اور اس کا خلیفہ اور اس اُمت کا امام اور مولا ہے وہ خدا کی ایسی مضبوط رسّی ہے جو کسی وقت ٹوٹنے والی نہیں۔ (جامع الاخبار۔ صفحہ ۲۶)

اسی طرح رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''میرے بعد علیؑ کا مخالف کافر ہے اور اس کا دشمن مرتد ہے اور اس کو رد کرنے والا تباہ ہونے والا ہے اور اس کے ساتھ شرک کرنے والا مشرک اور اس سے محبت کرنے والا مومن ہے اور اس کی پیروی کرنے والا اس سے مل جانے والا ہے۔ (اسماء والقاب امیرؑ المومنین۔ صفحہ ۳۱۹)

شرک اس کے سوا کچھ نہیں اور یہی کام ہے جو بکثرت کیا جاتا ہے اور اسے توحید سمجھا جاتا ہے۔

واحد اور اَحد میں فرق

ان دونوں کا مطلب مطلق ایک ہے لیکن واحد وہ ہے جہاں اس کا اقرار صفات کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اَحد وہ ہے جہاں اس سے صفات کی نفی کی جاتی ہے۔ چونکہ اس کی معرفت ہم پر واجب ہے اور معرفت صفات کے ذریعے کی جاتی ہے اس لئے ہماری تکلیف واحد تک محدود ہے۔ اس سے آگے نہ ہم سوچ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ جو وجود بشر کیلئے غیرِ معلوم ہو، جو زمان و مکان سے باہر ہو، جس کو بیان نہ کیا جاسکتا ہو، ہمارے حواس جسے درک نہ کر سکتے ہوں، جو نہ وہم میں آسکتا ہو نہ گمان میں، اُس کے بارے میں ہم کیا جان سکتے ہیں اور کیا بول سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں خود کو واحد تک ہی محدود رکھنا چاہیئے، اس سے آگے قدم بڑھایا تو دشتِ حیرت میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ اس مطلب کو امام جعفر صادقؑ اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

مشارق الانوار۔ صفحہ ۲۳۲۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اے جابر! بیان اور معانی سے وابستہ رہو''۔ جابر نے عرض کی کہ ''مولاؑ! بیان کیا ہے اور معانی کیا ہے؟''۔ مولاؑ نے فرمایا۔ ''بیان یہ ہے کہ تم جان جاؤ کہ اللہ کی مثال کسی چیز سے نہیں دی جاسکتی لہٰذا اس کو مثل و مثال سے دُور رکھو اور اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ۔ جبکہ معانی کے معنی یہ ہے کہ ہم ہی اللہ کے معانی ہیں، اللہ کا جنب ہیں، اللہ کا امر ہیں، اللہ کا حکم ہیں، اللہ کا کلمہ ہیں۔ اللہ کا علم ہیں، اللہ کا حق ہیں اور ہم جو جب چاہتے ہیں وہی اللہ چاہتا ہے اور جو ہم ارادہ کرتے ہیں اللہ بھی وہی

ارادہ کرتا ہے۔ہم وہ وجہہ اللہ ہیں جو زمین پر تمہارے امور کی جانچ کر کے بتائے۔ پس جو ہمیں جان گیا اس کے سامنے یقین ہے اور جو ہمیں نہیں جانتا اس کے سامنے سجین ہے۔اور اگر ہم چاہیں تو زمین کی فضاؤں کو چیر کر آسمان پر سعود کر جائیں۔تمام مخلوق کی بازگشت ہماری طرف ہے۔پھر ہم ہی ان کا حساب لینے والے ہیں‘‘۔

ہم سمجھتے ہیں کہ توحید کی جتنی وضاحت امامؑ نے کردی ہے،اس سے زیادہ وضاحت کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اور نہ عقلمندوں کیلئے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے لہٰذا توحید کے بارے میں صحیح ترین عقیدہ یہ ہے کہ ان کا ایک رب تسلیم کرلیا جائے اور پھر یہ یقین کرلیا جائے کہ سب کچھ یہی ہیں،نام جو چاہو دے لو۔ یہ تو مولوی ہے جو لفظوں سے ڈرتا ہے اور دوسروں کو بھی ڈراتا ہے ورنہ جو صاحبانِ فہم ہیں وہ جانتے ہیں کہ الفاظ مخلوق ہیں اور مخلوق اپنے خالق کا احاطہ نہیں کرسکتی۔وہ صرف اتنا ہی جان سکتی ہے جتنا خالق خود بتادے۔لیکن اگر میرے کسی بھائی کو مکمل اطمینان اب بھی حاصل نہ ہوا ہو تو اتمامِ حجت کیلئے ہم حضرتِ ختمی مرتبتؐ کا ایک فرمان پیش کئے دیتے ہیں۔ انشاءاللہ شفا ہوگی۔

بحر المعارف (فارسی) جلد ۲ صفحہ ۷ ۳۔

جب کعبے میں دوشِ رسولؐ پر کھڑے ہو کر مولا علیؑ بتوں کو توڑ رہے تھے تو آپؑ کے دل میں یہ خیال آیا کہ نبیؐ کے کاندھوں پر پاؤں رکھنا بے ادبی ہے۔چنانچہ جب زمین پر تشریف لائے تو شرمندگی کی وجہ سے پیشانیِ مبارک سے پسینہ شبنم کے قطروں کیطرح گر رہا تھا۔آپؑ نے رسولؐ اللہ سے فرمایا کہ ’’یا رسولؐ اللہ! میں شرمندہ ہوں

کہ میں نے اپنے پاؤں آپ کے دوش ہائے مبارک پر رکھے''۔تو اس وقت رسولؐ اللہ نے فرمایا۔''یا علیؑ! جب میں شبِ معراج بلند ہوا اور اَو ادنیٰ کی خلوت گاہ تک پہنچا تو شوقِ وصلِ دوست میرے جسم پر طاری ہو گیا اور میرا جوڑ جوڑ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس وقت ایک ہاتھ میرے کاندھے پر آیا تو مجھے قرار آ گیا اور میرے اندر کی تمام وحشت دُور ہو گئی۔اُس کیفیت کیلئے میں برسوں سے تڑپ رہا تھا لیکن آج جب تو نے اپنے پاؤں میرے کاندھے پر رکھے تو مجھے وہی ٹھنڈک ملی جو اُس ہاتھ سے ملی تھی''۔

اِس حدیثِ مبارکہ سے پتہ چل گیا کہ رسولؐ اللہ کو''اسرا بعبدہٖ'' کے عنوان سے جو اپنی خلوت گاہ تک لے گیا۔اور جس نے رسولؐ اللہ کے کاندھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کے دل کو ٹھنڈک بخشی تھی وہ وہی تھا جس نے کعبے میں ان کے کاندھوں پر اپنے پاؤں رکھے تھے اس لئے تاثیر بھی معراج والی تھی اور اس طرح گویا رسولؐ اللہ نے دوسری مرتبہ خلوت گاہِ''اَو ادنیٰ'' کا مزا چکھا تھا۔رسولؐ اللہ کی جو حدیث ہم نے پیش کی ہے اس کے آخر میں آپؐ کا ایک اور جملہ بھی ہے مگر وہ ہم بیان نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں اپنی جان عزیز ہے۔

''کُنتُ کنزاً مخفیا'' ایک ایسا مقام ہے جو''ہُو ئیت'' سے بھی بلند تر ہے کیونکہ ہوئیت کیطرف''ہُو'' کا اشارہ جاتا ہے اور اشارہ اسی طرف کیا جاتا ہے جسے انسان جانتا ہو یا جان سکتا ہو۔مقام''کنزاً مخفیا'' کو نہ تو ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں۔ہم نے تو اتنا ہی جانا ہے جو اس نے اپنے اِس ارشاد کے پردے میں ہم کو بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ مقام محبت کا ظہورِ اوّل ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں مشیّتِ خدا

حرکت میں آئی اور ارادے کو بے نقاب کیا۔ یہی وہ مقام ہے جو خلق کا نقطۂ آغاز ہے اس لئے کہ نقطہ خود اس خلق کے اندر بیٹھا ہوا ہے جو خلّاقِ کون و مکان اور اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اسی لئے عرفاء رسولؐ اللہ کو ''ب'' سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''ب'' وجودِ محبت کا اظہارِ اوّل ہے اور نقطہ خود وجودِ محبت ہے جو بصورتِ ''ب'' یعنی اوّلِ موجود ظہور پذیر ہوا ہے، یہی ''ب'' ہے جو عبد و معبود کے درمیان ربط اور رابطہ پیدا کرتا ہے اور اس کے اور معبود کے درمیان وسیلہ وہ نقطہ ہے جو اسے وجود میں لایا ہے۔ یہ نقطہ نہ ہو تو صورتِ ''ب'' نمودار نہ ہوگی۔ یعنی ظہورِ عالمِ کون بغیر نقطۂ وجود کے محال ہے۔ یہ نقطۂ وجود نہ ہوتا تو بندہ (عبد) نہ ہوتا اور بندہ نہ ہوتا تو خدا کو خدا کون کہتا''۔

یہاں اِس ''ب'' کی مزید وضاحت ہم ایک اور طریقے سے کرتے ہیں:۔

[ا]۔

ع

م - ع - [ب] - و - د

د

۲۔

ر

ر ۔ ا ۔ **ب** ۔ ط ۔ ہ

ط

پہلی صورت میں آپ دیکھیں گے کہ ''ب'' عبد اور معبود دونوں کا مرکز ہے۔ اگر ''ب'' نہ ہو تو عبد عبد نہیں رہتا اور معبود معبود نہیں رہتا۔ دوسری صورت میں ''ب'' ربط اور رابطہ دونوں کا مرکز ہے۔ اگر ''ب'' نہ ہو تو عبد و معبود کے درمیان نہ کوئی ربط باقی رہتا ہے اور نہ ان دونوں میں کسی قسم کا رابطہ ممکن رہتا ہے۔ اور چونکہ ''ب'' کی اصل نقطہ ہے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ علیؑ وہ واحد ذریعہ و وسیلہ ہے جو مخلوق کو توحید سے روشناس کراتا ہے، اس طرح کہ وہ توحید کی تمام خصوصیات لئے ہوئے ہے اور جب وہ اِن تمام خصوصیات کے ساتھ ظہور کرتا ہے تو مخلوق اُسی کو خدا سمجھتی ہے لیکن جب وہ سجدہ کرتا ہے تو ہر عقل اُس اَن دیکھے خدا کو تسلیم کر لیتی ہے جس کا اقرار بظاہر ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ہماری توحید وسیلے تک محدود ہے اور اس سے آگے بڑھنے کی ہماری مجال ہی نہیں۔ جو شخص حقیقتِ وسیلہ سے ناآشنا ہے وہ زندگی بھر سر مارتا رہے پھر بھی توحید کی بُو تک نہیں سونگھ سکتا۔

جو لوگ ہم پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں وہ سن لیں کہ ہم علیؑ کو کیا جانتے ہیں۔ ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ علیؑ قائم بالذات ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو قائم بالذات ہے اُسے

پہچانا نہیں جاسکتا لیکن علیؑ وہ وجود ہے جس کو دیکھکر وہ نہ پہچانے جانے والا وجود پہچانا جاتا ہے۔کسی کو کیسے پہچانا جاتا ہے؟ اُس کے چہرے سے،اس کی آنکھوں سے،اس کی گفتگو سے۔اسی لئے علیؑ کو وجہ اللہ،عین اللہ اورلسان اللہ کہتے ہیں۔

ظہورِتوحید

وہ ذاتِ اقدس جو علیؑ کا رب ہے وہ ایسی تنہا ہے کہ جس چیز کو ہم تنہائی سمجھتے ہیں اُس کی بھی مجال نہیں کہ اُس بارگاہ میں قدم رکھ سکے۔اگر کوئی عقل سے عاری انسان توحید سے مراد اُس ذات کی معرفت لیتا ہے وہ یا تو پاگل ہے یا خالص مشرک کیونکہ معرفت ذات کی نہیں ہوتی بلکہ صفات کی ہوتی ہے اور صفات بھی وہ جو ظاہر ہو جائیں۔یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی صفت بھی نہیں۔جس چیز کو ہم اس کی صفت سمجھتے ہیں وہ اس کا اثر ہے اور یہ اثر ہی ہے جو صفات کو خلق کرتا ہے جیسا کہ مشارق الانوار صفحہ ۲۲۰ پر مولا امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔''میں علم پیدا کرتا ہوں''۔ہم مزید وضاحت کر دیں کہ علم میرے مولاؑ کی ذات ہے۔اس علم سے مشیت ظاہر ہوتی ہے اور مشیت اُس علم کو خلق کرتی ہے جو صفت ہے۔آئمہؑ طاہرین نے بھی جس علم کا اظہار کیا ہے وہ یہی علمِ مخلوق ہے جس پر دنیا دنگ نظر آتی ہے اور نجس عقلیں جس کا انکار کرتی ہیں۔ان صفات سے توحید کا تعارف نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے وہ صفت چاہیئے جو میرے مولاؑ کی عینِ ذات ہے۔جتنی بھی صفاتِ ذات ہیں (یا صفاتِ فعل ہیں) ان کی جامع صفتِ ولایت ہے چنانچہ توحید کا تعارف کرانے کیلئے ولایت کا ظہور کرنا لازمی

ہے۔ لیکن صفت ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک اس کا کوئی موصوف نہ ہو۔ آپ شجاعت کو نہیں جان سکتے جب تک کسی بہادر کو شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔ اسی طرح سخاوت کو نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کسی سخی کو سخاوت کرتے ہوئے نہ دیکھ لیا جائے۔ اس لئے ولایت کو بھی ظہور کرنے کیلئے ایک ولی کی ضرورت ہے اور یہ ولی جب مخلوق کیلئے ظاہر ہوتا ہے تو امام کی صورت میں آتا ہے۔ لٰہذا بغیر معرفتِ امامؑ توحید کو جان لینا محالِ ابدی ہے کیونکہ امامؑ لا الٰہ الّا اللہ کا ظاہر ہوتا ہے اور یہ واحد ذریعہ ووسیلہ ہے جس سے توحید کی معرفت ممکن ہو سکتی ہے۔ اب حضرتِ ختمی مرتبتؐ کے اُس فرمان کا مطلب سمجھ میں آ جانا چاہیئے جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ "جو شخص بغیر معرفت امامؑ کے مر گیا وہ کافر و منافق کی موت مرا"۔ اس فرمان میں آپؐ نے نہ توحید کا نام لیا اور نہ اپنی نبوت کا ذکر کیا بلکہ صرف معرفتِ امامؑ کو لازمی گردانا ہے جس سے ہماری بات کی مکمل تصدیق ہو جاتی ہے۔

جو لوگ واہی تباہی بکتے پھرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں توحید کی ابجد کا بھی پتہ نہیں۔ وہ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے کام ہو رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود کر رہا ہے۔ اللہ نے قرآن میں رسولؐ اللہ سے فرمایا۔ "کیا ہم نے تمھیں یتیم نہیں پایا اور تمھیں پناہ دی"۔ حالانکہ یہ کام جنابِ ابو طالبؑ نے کیا۔ تو حضرت ابو طالبؑ کو بھی خدا مانو۔ اللہ نے فرمایا۔ "کیا ہم نے تجھے تنگدست نہیں پایا اور تجھے غنی کر دیا"۔ حالانکہ یہ کام جناب خدیجہؑ نے کیا۔ تو پھر جنابِ خدیجہؑ کو بھی خدا مانو۔ اللہ نے کہا کہ میں خلق کرتا ہوں جبکہ حضرت عیسیٰؑ خلق کرنے کی نسبت اپنی طرف دے رہے ہیں۔ تو

پھر حضرت عیسیٰؑ کو بھی خدا مانو۔ اللہ کا ایک نام مصوّر بھی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ ماؤں کے رحم میں بچے کی تصویر میں بناتا ہوں۔ جبکہ یہ ثابت ہے کہ یہ تصویر حضرتِ جبرئیلؑ بناتے ہیں۔ تو پھر حضرتِ جبرائیلؑ کو بھی خدا مانو۔ اللہ دعویٰ کرتا ہے کہ بارشیں میں برساتا ہوں جبکہ یہ کام حضرت میکائیلؑ کرتے ہیں۔ تو پھر حضرتِ میکائیلؑ کو بھی خدا مانو۔ میں اگر خدائی کاموں کی تفصیل بیان کرنے بیٹھ جاؤں تو پھر ان جعلی اور جاہل موحّدوں کو لاکھوں خدا ماننا پڑ جائیں گے۔ آئمہؑ طاہرین کا مقام تو بہت بلند ہے۔ یہ سارے کام تحتِ امر ہوتے ہیں اور امامؑ اولی الامر ہوتا ہے اور فرشتے اس کے نوکر اور کارکن ہوتے ہیں جو اُس کے حکم پر یہ سارے امور سرانجام دیتے ہیں جیسا کہ سورۂ انّا انزلنا سے ثابت ہے۔ یہ کیا غضب ہے کہ ان کاموں کو اگر نوکروں اور غلاموں کیطرف منسوب کریں تو وہ تو بندے کے بندے ہی رہیں اور اگر امامؑ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو یہ شرک ہو جائے اور یہ الزام لگایا جائے کہ ہم نے علیؑ کو خدا بنا دیا ہے۔ ان کو سوچنا چاہیئے کہ ان کا خدا کون ہے؟۔ کیا وہ کوئی کھلونا ہے کہ جس کے جی میں آئے اس کو جہاں چاہے رکھ دے اور وہ بے چارہ خاموش اپنی یہ گت بنتی دیکھتا رہے۔ یہ تو بت پرستی کی بدترین شکل ہے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ''فعل'' کو اللہ کی طرف نسبت نہیں دی جاسکتی بلکہ کچھ ہستیاں ہیں جو اس کے افعال کے امین ہیں۔ کرتے وہ ہیں اور نسبت اللہ کی طرف جاتی ہے اور یہی توحیدِ خالص ہے۔

یہ کتاب ''کشف التوحید'' آج ۲۸ / اپریل ۲۰۱۱ء مطابق ۲۴ جمادی الاوّل ۱۴۳۲ھ بروز جمعرات بوقت 9 بجے صبح بتوفیق و تائیدِ خداوندی اور بہ امدادِ حضرتِ صاحب الزمانؑ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

الحمد للهِ ربّ العٰلمین والصلاۃ و السلامُ علیٰ خاتم النبیین و آلہٖ الطیبین الطاھرین المعصومین المظلومین ولعنۃ اللہ علیٰ اعداءھم اجمعین من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدین۔

تحفہ یا علیؑ مدد